دین کا کام

کرنے والوں کیلئے چند ضروری باتیں

دین کا کام کرنے کی کوئی بھی صورت ہو
دعوت و تبلیغ ہو یا جہاد و اسلامی انقلاب کی
کوشش ہو یا مدارس کا نظام ہو یا ارشاد و سلوک
ہو ان سے وابستہ تمام افراد کیلئے دین کے
اہم رہنما اصول

تصنیف

حضرت ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب

رئیس دار الافتاء جامعہ مدنیہ لاہور

رئیس دار الافتاء والتحقیق جامع مسجد الھلال چوبرجی پارک لاہور

مکتبۃ المرتضیٰ

دوکان نمبر 1 سلطانی محلہ کبیر سٹریٹ اردو بازار

لاہور۔ فون نمبر: 7311976

دین کا کام

کرنے والوں کیلئے چند ضروری باتیں

دین کا کام کرنے کی کوئی بھی صورت ہو
دعوت و تبلیغ ہو یا جہاد و اسلامی نقلاب کی
کوشش ہو یا مدارس کا نظام ہو یا ارشاد و سلوک
ہو ان سے وابستہ تمام افراد کیلئے دین کے
اہم رہنما اصول

تصنیف

حضرت ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب
رئیس دارالافتاء جامعہ مدنیہ لاہور
رئیس دارالافتاء والتحقیق جامع مسجد الھلال چوبرجی پارک لاہور

مکتبۃ المرتضیٰ
دوکان نمبر 1 سلطانی محلہ کبیر سٹریٹ اردو بازار
لاہور۔ فون نمبر: 7311976

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انا نحن نزلنا الذکر و انا له لحافظون

(بے شک ہم ہی نے ذکر (قرآن) کو نازل کیا اور ہم ہی اسکی حفاظت کرتے ہیں)

اللہ نے دین متین کی حفاظت خود اپنے ذمہ لی۔ ابتدائے وحی سے انتہاء تک اور پھر رہتی دنیا تک دین اور اس کے احکام محفوظ رہیں گے۔ ختم الرسل حضرت محمد ﷺ نے جہاں قرآن کی اشاعت کتابی شکل میں کی وہاں احادیث مبارکہ بھی لکھوا کر صحابہ کرام کو دیں یوں قرآن وسنت کی اشاعت سلسلہ بسلسلہ ہمارے اس زمانہ تک پہنچی۔

اللہ سے دُعا ہے کہ اس اہم فریضہ کو احسن انداز میں نبھانے کی توفیق مرحمت فرمائے اور اس طبع ونشر میں اخلاص پیدا فرمائے۔

معزز قارئین طباعت کی غلطیوں پر مطلع فرما کر عنداللہ ماجور ہوں؛

مکتبۃ المرتضیٰ

دوکان نمبر 1 سلطانی محلہ کبیر سٹریٹ اُردو بازار لاہور

7311976

یہ کتاب

حضرت مفتی عبدالواحد صاحب

کی اجازت سے شائع کی جارہی ہے

کچھ کتاب کے بارے میں

نام کتاب　　دین کا کام کرنے والوں کے لئے چند ضروری باتیں

مولف　　حضرت ڈاکٹر مفتی عبدالواحد صاحب

تعداد　　۱۱۰۰

ناشر　　مکتبۃ المرتضیٰ سلطانی محلّہ کبیر سٹریٹ اُردو بازار لاہور

کتاب ھذا کو درج ذیل کتب خانوں سے طلب فرمائیں

☆ مکتبۃ العلم　　☆ مکتبہ قاسمیہ

☆ مکتبہء رحمانیہ　　☆ مکتبہ سید احمد شہیدؒ

☆ مکتبہء حسن　　☆ مکتبۃ الحرم

اور تمام معیاری کتب خانوں سے اصرار فرمائیں

گزارش

بسم اللہ حامداً و مصلیاً۔ الحمد للہ ہمارے ہاں بہت سے لوگوں کو دین کی فکر ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ لوگ دین پر آ جائیں۔ اسی سے امید ہے کہ مسلمانوں کو ان کی عظمت رفتہ دوبارہ حاصل ہو جائے۔ غرض تو سب ہی کی بہت اچھی ہے لیکن اس کے لئے بعض کام کرنے والے جو تفصیلی فکر لوگوں کو دیتے ہیں اس میں افسوسناک حد تک کچھ سقم اور نقائص نظر آتے ہیں اور ڈر ہوتا ہے کہ دین کے تصورات میں یہ کوتاہی آگے چل کر کوئی اور ہی رنگ نہ دکھائے۔ اس لئے بنام خدا ہمت کر کے چند باتوں پر قلم اٹھایا ہے تاکہ فکر مند لوگ اس طرف توجہ کریں اور اگر بات کو درست پائیں تو کوشش کریں کہ اصلاح احوال ہو سکے اور لوگوں میں غلط تصورات جڑ نہ پکڑ لیں۔ یہ باتیں ہم نے خوب اچھی طرح غور و فکر کر کے لکھی ہیں، جلد بازی یا ضد بازی میں نہیں لکھیں۔ پھر بھی اگر کوئی دلائل سے ہماری کسی غلطی کی نشاندہی کرے گا تو ہم اس کے ممنون ہوں گے اور انشاء اللہ اپنی غلطی کی تصحیح کریں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیشہ اپنی حفاظت اور دین و دنیا کی عافیت میں رکھیں اور سب مسلمانوں کو اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ (آمین)

عبد الواحد

دار الافتاء۔ جامعہ مدنیہ

لاہور

جمادی الاخری ۱۴۲۲ھ

فہرست مضامین

-1	دین کا کیا مطلب ہے	1
-2	عبادت	8
-3	کسی دینی تحریک وجماعت کے سربراہ کے لئے ضروری اوصاف	13
-4	امر بالمعروف ونہی عن المنکر	16
-5	دعوت وتبلیغ	20
-6	دعوت وتبلیغ کے بارے میں چند غلط فہمیوں کا ازالہ	28
-7	جہاد	36
-8	جوان شادی شدہ مردوں کا چار ماہ سے زائد گھر سے دور رہنا	42
-9	خلافت	47
-10	سنت وبدعت کے اصول	50
-11	تقلید اور ترک تقلید	54
-12	دین کا علم حاصل کرنا	62
-13	مکروہات کا ارتکاب	65
-14	بدعتی کے پیچھے نماز	67
-15	پہلے بزرگوں پر تنقید اور طعن وتشنیع	69

دین کا کیا مطلب ہے؟

اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کے واسطے سے اپنے بندوں پر اپنی اطاعت کی جو باتیں مقرر فرمائی ہیں تاکہ ان کے ذریعے سے وہ اللہ تعالیٰ کا قرب اور اس کی رحمت حاصل کریں ان سب باتوں کے مجموعہ کو دین کہتے ہیں اور اس دین کا نام اسلام ہے قرآن پاک میں ارشاد ہے: وَ مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران: 85) اور جو کوئی چاہے اسلام کے علاوہ دین کو تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا۔

دین کی باتیں دو طرح کی ہیں۔

1- کچھ وہ ہیں جو اصولی ہیں اور کبھی منسوخ نہیں ہوتیں جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کی معرفت اور دیگر ایمانیات مثلاً انبیاء علیہم السلام پر، فرشتوں پر، کتب سماویہ پر، قیامت کے دن پر اور تقدیر پر ایمان رکھنا اور یہ ایمان رکھنا کہ احکام صرف اللہ تعالیٰ ہی دیتے ہیں اور ان کے دیئے ہوئے احکام کو بجالانا ہماری ذمہ داری ہے۔ ان ہی باتوں میں سے یہ بھی ہے کہ اخلاق فاضلہ کو حاصل کیا جائے۔ یہ باتیں تمام ادیان سماویہ میں مشترک ہیں اور قرآن میں فقط ان باتوں کو بھی مجازاً دین کہا گیا ہے قرآن پاک میں ہے۔

شَرَعَ لَکُمْ مِنَ الدِّیْنِ مَاوَصّٰی بِهٖ نُوْحًاوَّالَّذِیْ اَوْحَیْنَا اِلَیْكَ وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖ اِبْرَاهِیْمَ وَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ (سورہ شوریٰ)

راہ ڈال دی تمہارے لئے دین میں وہی جس کا حکم کیا تھا نوح کو اور جس کا حکم کیا ہم نے ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو یہ کہ قائم رکھو دین کو اور اختلاف نہ ڈالو اس میں۔

2- اور کچھ وہ ہیں جن کا تعلق عملی احکام سے ہے ان میں حسب مصلحت زمانہ تبدیلی

2-اور کچھ وہ ہیں جن کا تعلق عملی احکام سے ہے ان میں حسب مصلحت زمانہ تبدیلی ہوتی رہی ہے اور مختلف رسولوں کے ادوار میں ان میں سے بعض منسوخ ہوتی رہی ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو احکام دیئے گئے ان میں سے بعض حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں تبدیل کر دیئے گئے قرآن پاک میں ہے

وَلِأُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ (سورہ آل عمران: 50)

"اور تاکہ حلال کر دوں تمہارے لئے بعض وہ چیزیں جو حرام کی گئی تھیں تم پر"۔

ان باتوں کو شریعت کہتے ہیں جس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ طریقہ۔

چونکہ ہر نبوی دور کی شریعت دوسری سے مختلف رہی ہے اس لئے فرمایا: لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا (مائدہ: 48)

"تم میں سے ہر ایک کے لئے بنائی ہم نے شریعت اور راہ"

پھر آخر میں رسول اللہ ﷺ کو آخری شریعت دی گئی۔ فرمایا:

ثُمَّ جَعَلْنَاكَ عَلَىٰ شَرِيعَةٍ مِّنَ الْأَمْرِ فَاتَّبِعْهَا (جاثیہ: 18)

"پھر ہم نے آپ کو کیا دین کے ایک طریقہ پر"

اور چونکہ آپ کے بعد کوئی اور نئی نبوت نہیں ہے اس لئے آپ ﷺ کی شریعت غیر متبدل ہے۔

ایک اور اصطلاح ملت کی ہے۔ یہ دین کے ہم معنی ہے البتہ دونوں میں اتنا فرق ہے کہ دین کی اضافت و نسبت خدا رسول اور امت ان سب کی طرف ہو سکتی ہے مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں اللہ تعالیٰ کا دین، رسول خدا کا دین اور امت کے ایک فرد مثلاً زید کا دین جب کہ ملت کی اضافت و نسبت صرف رسول کی طرف ہو سکتی ہے خدا کی طرف اور امت کی طرف نہیں ہو سکتی۔ قرآن پاک میں فرمایا: مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا

دین کی باتوں کی تفصیل

دین کی باتیں پانچ قسم کی ہیں۔

1-عقائد 2-عبادات 3-معاملات 4-سزائیں 5- آداب

ان میں سے آداب کو چھوڑ کر باقی ہر ایک کی پھر موٹی موٹی پانچ قسمیں ہیں:

عقائد

(1) اللہ تعالیٰ پر ایمان (2) فرشتوں پر ایمان

(3) کتب الٰہیہ پر ایمان (4) رسولوں پر ایمان

(5) یوم آخرت پر ایمان

عبادات

(1) نماز (2) زکوٰۃ (3) روزہ (4) حج (5) جہاد

معاملات

(1) مالی معاملات (2) عائلی معاملات مثلاً نکاح طلاق وغیرہ

(3) باہمی جھگڑے اور امور عدالت (4) امانت کے معاملات

(5) ترکہ اور میراث

سزائیں (جن کا خوف آدمی کو ارتکاب جرم سے روکے)

(1) کسی کو ناحق قتل کرنے پر (2) کسی کا مال ناحق لینے پر

(3) کسی کے ساتھ بدکاری پر (4) کسی پر بدکاری کا ناحق الزام لگانے پر

(5) کسی مسلمان کے اسلام ترک کرنے پر

آداب

(1) اخلاق (2) اچھے طور طریقے اور عمدہ باتیں

(3) حکومتی امور (4) معاشرتی امور

موجودہ دور میں دین کے بعض کام کرنے والوں نے اس سے ہٹ کر دین کا مختلف معنی بتایا۔ انہوں نے دیکھا کہ قرآن پاک کے اندر دین کا لفظ جزاء کے لئے بھی استعمال ہوا ہے جیسے مَالِكِ يَوْمِ الدِّين اور اطاعت کے معنی میں بھی جیسے وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا "اور اسی کی اطاعت ہمیشہ لازم ہے" اور شریعت و قانون کے معنی میں بھی جیسے

مَاكَانَ لِيَاخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ (سورہ یوسف) ''اس کو حق نہیں تھا کہ پکڑے اپنے بھائی کو بادشاہ کے قانون میں''

پھر دلائل کے بغیر انہوں نے ان سب معانی کو اپنی طرف سے جوڑ کر دین کا ایک نیا مطلب نکالا اور اس کو یوں بیان کیا۔

دین ایک ایسا نظام زندگی ہے جس میں انسان کسی کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کر کے اس کی اطاعت و فرمانبرداری قبول کر لے اس کے حدود و قوانین کے تحت زندگی بسر کرے اس کی فرمانبرداری پر عزت ترقی اور انعام کا امیدوار ہو اور اس کی نافرمانی پر ذلت و خواری اور سزا سے ڈرے۔ غالباً دنیا کی کسی زبان میں کوئی اصطلاح ایسی جامع نہیں ہے جو اس پورے نظام پر حاوی ہو۔ موجودہ زمانہ کا لفظ **STATE** کسی حد تک اس کے قریب پہنچ گیا ہے۔

کچھ مختصر الفاظ میں اس کو یوں بھی بیان کیا گیا۔

''دین کے معنی ہیں ایک پورا نظام زندگی اور مکمل ضابطہ حیات جس میں ایک ہستی یا ادارے کو مطاع مقنن اور حاکم مطلق مان کر اس کی جزا کی امید اور سزا کے خوف سے اس کے عطا کردہ یا جاری و نافذ کردہ قانون اور ضابطے کے مطابق اس ہستی (یا ادارے) کی کامل اطاعت کرتے ہوئے زندگی بسر کی جائے''۔

یہ حضرات دین کا جو مطلب بتا رہے ہیں اس کے مطابق دین صرف اس وقت ہوگا جب دین کو حکومت میں کامل غلبہ حاصل ہو اور پورے نظام کے تمام شعبے اللہ تعالیٰ کے حکموں کے مطابق ہوں اور اگر ایسا نہ ہو تو دین نہیں ہے اور آج کل بہت سے مسلمان ملکوں میں رہنے والے اور کافر ملکوں میں رہنے والے مسلمان یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کا دین اسلام ہے۔ یہ بات مندرجہ ذیل وجوہ سے غلط ہے۔

1- وفات کے بعد قبر میں جو سوال کئے جاتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ تیرا دین کیا ہے؟ حدیث میں ہے کہ مومن جواب میں کہتا ہے کہ میرا دین اسلام ہے۔ دین کی جو

تعریف یہ حضرات بتاتے ہیں اس کے مطابق آج کل کوئی بھی مسلمان اس سوال کا جواب نہیں دیتا ہوگا۔

2- لفظ دین کی یہ تفسیر جو ان حضرات نے کی ہے یہ ان کا صرف دعویٰ ہے اس کی کوئی دلیل انہوں نے نہیں دی۔ اور قرآن پاک کے جن مقامات میں یہ دین کا مذکورہ معنی کرتے ہیں وہاں صرف ان کا ذکر کردہ معنی لینے کی کوئی قطعی دلیل نہیں ہے بلکہ کہیں اطاعت کا معنی بھی بن سکتا ہے اور کہیں طریقہ اور شریعت کا معنی بھی بن سکتا ہے۔ چونکہ یہ بات بلا دلیل ہے لہٰذا یہ ایسی تفسیر بالرائے ہے جس سے ہمیں دین نے بچنے کا حکم دیا ہے۔

اقامت دین

دین کا جو صحیح مطلب ہم نے ذکر کیا ہے اس کے مطابق

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَاوَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِىْ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ (سورہ شوریٰ 13)

"(اے مسلمانو) تمہارے لئے ہم نے مقرر کیا از جنس دین وہی جس کی وصیت کی تھی نوح کو اور جو وحی کی ہے ہم نے اے نبی تیری جانب اور جس کی وصیت کی تھی ہم نے ابراہیم کو اور موسیٰ کو اور عیسیٰ کو کہ دین کو قائم کرو"۔

اس آیت میں اقیموا الدین یعنی اقامت دین سے مراد ہے دین کی ان باتوں پر پورا پورا عمل کرنا جو اصولی ہیں اور تمام سماوی ادیان میں مشترک ہیں اور کبھی منسوخ نہیں ہوتیں۔

تفسیر روح المعانی میں ہے۔ **لم یبعث نبی الا امر باقامة الصلوة و ایتاء الزکوة والا قرار باللہ تعالیٰ و طاعته سبحانه و ذالك اقامة الدین**

جو نبی بھی مبعوث ہوا اس کو نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے اور اللہ تعالیٰ کو ماننے

اور اس کی اطاعت کرنے کا حکم دیا گیا اور ان کو پورا کرنے کو اقامت دین کہتے ہیں۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ اپنی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں۔

یجب ان یکون المراد من ھذا الدین شیئا مغایرا للتکالیف والا حکام و ذلك لانها مختلفة قال الله تعالیٰ لکل جعلنا منکم شرعة و منها جا فیجب ان یکون المرادمنه الامور التی لا تختلف با ختلاف الشرائع وھی الایمان بالله تعالی و ملائکته و کتبه و رسله والیوم الآخر والایمان یوجب الاعراض عن الدنیا و الاقبال علی الآخرة و السعی فی مکارم الاخلاق و الا حتراز عن رذائل الاحوال

ضروری ہے کہ یہاں دین سے مراد ایسی شے ہو جو تکالیف و احکام کی غیر ہو کیونکہ تکالیف و احکام (ہر نبی کے لئے) مختلف اور جدا جدا ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَا جاً "تم میں سے ہر ایک کے لئے بنائی ہم نے شریعت اور راہ" لہٰذا ضروری ہے کہ اس سے مراد وہ باتیں ہوں جو شریعتوں کے بدلنے سے نہیں بدلتیں اور وہ ہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان لانا اور ایمان واجب کرتا ہے دنیا سے اعراض کرنے کو اور آخرت کی طرف توجہ کرنے کو اور مکارم اخلاق کے حاصل کرنے کو اور گھٹیا احوال سے بچنے کو۔

لیکن جن لوگوں نے دین کا مفہوم اپنی باطل اختراع سے بتایا جس کو ہم اوپر ذکر چکے ہیں تو مذکورہ بالا آیت میں اقامت دین کا مطلب انہوں نے اسلامی انقلاب برپا کرنا یا حکومت الہیہ کو قائم کرنا بتایا۔ ان حضرات نے جو مطلب بتایا ہے وہ چند وجوہ کی بناء پر باطل ہے۔

1- یہ تو فاسد پر فاسد کی بناء ہے کیونکہ جب دین کا مطلب ہی انہوں نے غلط بتایا تو اس کی بنیاد پر اقامت دین کا مطلب بھی غلط ہوا۔

2-اوپر ہم نے مفسرین کے حوالے سے آیت میں اقامت دین کا صحیح مطلب لکھا ہے اس کے برعکس ان حضرات کا بتایا ہوا مطلب اس صحیح مطلب کے بالکل خلاف ہے۔

3-مذکور آیت میں جن رسولوں کا ذکر ہے یعنی حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰؑ ان میں سے کوئی بھی اپنے علاقے میں بالفعل اسلامی حکومت قائم نہیں کر سکے اور یہ بات ممکن نہیں کہ ان اولوالعزم پیغمبروں کو ایک حکم ملے اور کوئی بھی اس کو پورا نہ کر سکے۔ لہذا خرابی ان حضرات کے بتائے ہوئے مطلب میں ہے۔اور یہ کہنا کہ ان رسولوں کے ذمے تو کوشش کرنا تھا اور وہ انہوں نے کی اس سے اعتراض ختم نہیں ہوتا بلکہ اس سے تو العیاذ باللہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض بن جاتا ہے کہ انہوں نے ایسا حکم دیا جو ان پیغمبروں کے بس کا ہی نہیں تھا اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے بجائے یہ حکم ہوتا کہ اسلامی انقلاب کے لئے کوشش کرو۔

4-اسلامی انقلاب برپا کرنا اس پر موقوف ہے کہ دشمنان اسلام شکست کھا کر بالکل مغلوب ہو جائیں اور مسلمان فتح یاب ہوں۔اس کے لئے عام طور سے جنگوں کی نوبت آتی ہے۔ جنگوں میں مسلمان ہی ضرور فتحیاب ہونگے اس کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ حکم تو اس بات کا دیا جاتا ہے جو بندے کے اختیار میں ہو اس کا نہیں جو بندے کے اختیار سے باہر ہو۔ جنگ کرنا تو بندے کے اختیار میں ہے لیکن جنگ جیت لینا بندے کے اختیار میں نہیں اسلامی انقلاب بالفعل برپا کرنے کا حکم تو تکلیف مالا یطاق ہے (یعنی ایسے حکم کا مکلّف بنانا جو بندے کی طاقت سے باہر ہے)۔

یہ ساری خرابیاں محض اس وجہ سے ہیں کہ لفظ دین کا معنی ہی غلط کیا۔

تنبیہ : اعلاء کلمۃ اللہ اور اسلامی حکومت قائم کرنے کی کوششوں کے بارے میں اور بہت سے دلائل موجود ہیں ان دلائل سے کام لینا چاہیے اور آیات کے معنی و تفسیر کو بدل کر غلط استدلال سے بچنا چاہیے۔

عبادت

اللہ تعالیٰ نے جن وانس کی تخلیق کی غایت کھلے کھلے انداز میں یہ بیان فرمائی کہ وہ میری عبادت کریں۔ فرمایا: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ

"اور میں نے نہیں پیدا کیا جنوں اور انسانوں کو مگر اس لئے کہ وہ میری عبادت کریں"۔

اسی وجہ سے قرآن پاک میں جابجا عبادت کا حکم دیا گیا۔ فرمایا:

یٰاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ

"اے لوگو عبادت کرو اپنے رب کی جس نے پیدا کیا تم کو اور ان کو جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ"۔

وَمَاۤ اُمِرُوْۤا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ

"اور ان (یعنی اہل کتاب) کو حکم یہی ہوا کہ عبادت کریں اللہ کی خالص کر کے اس کے واسطے دین کو"۔

جو ذات انتہائی درجے کی عظمت والی ہو اس کے سامنے دلی محبت کے ساتھ انتہائی درجے کی تواضع اور ذلت اختیار کرنے کو عبادت کہتے ہیں۔ اس کی صورتیں یہ ہیں کہ آدمی اس کی خوشی اور اس کی تعظیم کی خاطر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جائے اور اپنے آپ کو خوب جھکا دے یہاں تک کہ اس کے سامنے اپنا ماتھا زمین پر ٹیک دے۔ اس کے لئے کھانا پینا چھوڑ دے۔ اس کے نام پر اپنا عزیز مال خرچ کرے۔ اس کے لئے مخصوص ہیئت اختیار کر کے اور نفس کے تقاضوں کو ترک کر کے سفر کرے اور اس کے گھر کے گرد دیوانہ وار چکر لگائے۔ اور اس کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے اپنی جان تک قربان

کردے اور اپنا خون زمین پر بہادے اور چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے احکام بھی ہیں لہذا ان کو پورا کرنا اطاعت بھی ہے لیکن ایسی اطاعت جس میں انتہائی درجے کی عاجزی اور تذلل ظاہر ہے۔ دوسرے لفظوں میں نماز، روزہ، حج، زکوۃ اور جہاد عبادت کے وہ کام ہیں جن کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔

عبادت کی احسن اور علی وجہ الاتم ادائیگی چونکہ اس وقت ہو سکتی ہے جب دل محبت اور تعظیم کے جذبے سے بھرا ہوا ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کو ذہنی و قلبی فراغت اور یکسوئی حاصل ہو۔ یہ یکسوئی اس وقت ممکن ہے جب آدمی کی ایک تو بنیادی ضروریات پوری ہو رہی ہوں اور دوسرے وہ آپس کے جھگڑوں اور رنجشوں سے امن میں ہو۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں بنیادی ضرورتیں پوری ہونے کے لئے مسلمانوں کے افراد اور مسلمانوں کی اجتماعیت و حکومت کو احکام دیئے ہیں وہیں آپس کے جھگڑوں اور رنجشوں سے بچنے کے لئے آپس کے معاملات کے بارے میں احکام اور ہدایات عطا فرمائیں۔ ان احکام کا بنیادی نکتہ ہی یہی ہے کہ آپس کے جھگڑے کا کوئی اندیشہ نہ رہے۔

ہماری اس گزارش سے یہ بات حاصل ہوئی کہ مسلمان کی زندگی میں عبادت کو اصل کا مقام حاصل ہے اور معاملات کے احکام اس غرض سے ہیں کہ وہ عبادت جو کہ تخلیق کی غرض وغایت ہے اس کی ادائیگی میں یہ ممد و معاون ہیں۔

بعض حضرات نے عبادت کو کامل اطاعت یا دوسرے لفظوں میں غلامی کے معنی میں لیا ہے وہ کہتے ہیں

"بلکہ درحقیقت مومن کی ساری زندگی عبادت ہی عبادت ہے جب وہ کاروبار میں حرام کے فائدوں کو چھوڑ کر حلال کی روزی پر قناعت کرتا ہے تو کیا وہ عبادت نہیں کرتا جب وہ معاملات میں ظلم و جھوٹ اور فریب اور دغا سے پرہیز کر کے انصاف اور راست بازی سے کام لیتا ہے تو کیا یہ عبادت نہیں۔ پس حق یہ ہے کہ اللہ کے قانون

کی پیروی اور اس کی شریعت کے اتباع میں انسان دین اور دنیا کا جو کام بھی کرتا ہے وہ سراسر عبادت ہے حتی کہ بازاروں میں اس کی خرید و فروخت اور اپنے اہل و عیال میں اس کی معاشرت اور اپنے خالص دنیوی اشغال میں اس کا انہماک بھی عبادت ہے“۔

ان حضرات نے عبادت کا جو مطلب بتایا ہے وہ ایسا ہے جو قرآن و حدیث کی تصریحات کے خلاف ہے۔ان کے نزدیک جائز و حلال خرید و فروخت کرنا بھی عبادت ہے اور اپنے خالص دنیوی اشغال میں انہماک بھی عبادت ہے غرض دنیا کا جو کام بھی کرے وہ عبادت ہے جب کہ ایک حدیث میں ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ذکر کیا۔

یَاابْنَ آدَمَ تَفَرَّغْ لِعِبَادَتِیْ اَمْلَأْ صَدْرَكَ غِنًى اَسُدُّ فَقْرَكَ وَاِلاَّ تَفْعَلْ مَلأْتُ يَدَكَ شُغْلاً وَلَمْ اَسُدَّ فَقْرَكَ

”اے ابن آدم تو میری عبادت کے لئے فارغ ہو جا میں تیرے سینے کو غنا سے بھر دوں گا اور تیرے فقر کو بند کردوں گا اور اگر تو ایسا نہیں کرے گا تو تیرے ہاتھ کو (دنیوی) مشاغل سے بھر دوں گا اور تیرے فقر کو بند نہیں کروں گا“۔

جب دنیوی مشاغل بھی عبادت ہی ہیں تو پھر یہ کہنا کہ تو میری عبادت کے لئے فارغ ہو جا یعنی اپنے کچھ اوقات اس کے لئے فارغ کرلے بے معنی سی بات ہے حالانکہ حدیث کی بات بے معنی نہیں ہو سکتی۔

ایک اور حدیث میں ہے حضرت ابو ہریرہؓ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظِلِّهٖ يَوْمَ لَاظِلَّ اِلاَّ ظِلُّه، اِمَامٌ عَادِلٌ وَ شَابٌّ نَشَأَ فِيْ عِبَادَةِ اللّٰهِ ...... الخ)

سات آدمی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے سایہ میں جگہ دیں گے جس دن ان کے سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہو گا (ایک) عادل حکمران (دوسرا) وہ جوان جس نے اللہ کی

عبادت ہی میں پرورش پائی ہو۔
ان حضرات کے نزدیک عادل حکمران کے کام بھی تو سارے عبادت کے ہیں پھر بھی عبادت کی تخصیص ایسے شخص کے لئے کی جو نماز، روزہ، ذکر اذکار میں مشغول رہا ہو۔

غرض ان حضرات نے عبادت کا معنی سمجھنے اور سمجھانے میں غلطی کی ہے۔
عبادت دین کی ایک مستقل اصطلاح ہے جس کا مخصوص معنی ہے۔ اس میں خواہ کسی بھی وجہ سے ردوبدل کرنا صحیح نہیں۔

آگے ہم دو باتوں پر تنبیہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

1- اللہ تعالیٰ کے تمام احکام کی اطاعت اور فرمانبرداری ایک مستقل حکم ہے اس کے لئے ہم عبادت کی اصطلاح نہ بھی استعمال کریں تب بھی اللہ تعالیٰ کی کامل اطاعت اپنی جگہ ضروری ہے قرآن پاک میں اس کی واضح صراحت موجود ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً

اے ایمان والو اسلام و تابعداری میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

"اے ایمان والو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی"۔

جب کامل اطاعت کو بتانے کے لئے مستقل اصطلاح موجود ہے تو اس کی خاطر عبادت کی شرعی اصطلاح کو بدلنے کی کوئی ضرورت و مجبوری بھی نہیں۔

2- خرید و فروخت کرنا، کھانا پینا، سونا جاگنا، بیوی سے دل لگی کرنا صحبت کرنا، ورزش کرنا، رشتہ داروں سے ملنا سب باتیں ایسی ہیں جو عام طور پر مباح ہیں کہ ان کے کرنے پر ثواب نہیں اور نہ کرنے پر گناہ نہیں البتہ اس وقت بھی یہ ضروری ہے کہ اس کو شریعت کے موافق کیا ہو خلاف نہ کیا ہو۔ اگر خرید و فروخت کی لیکن ایسے طریقے پر جس سے دین و شریعت کا کوئی حکم ٹوٹتا ہو تو اس پر گناہ ہوتا ہے۔ غرض دین کے موافق

کرنے پر وہ مباح ہے ورنہ ناجائز طریقے کی وجہ سے خرید و فروخت بھی ناجائز کہلائے گی۔

البتہ جب ہم کسی مباح کو جائز طریقے پر کریں گے اور اس کے کرنے میں کسی نیکی کی نیت کرلیں مثلاً کھانا کھاتے ہوئے یہ نیت کرلیں کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی طاعات پر قوت حاصل ہوگی، مال اس نیت سے کمائے کہ آمدنی کو غریبوں کی مدد میں اور دین کی اشاعت میں خرچ کروں گا، ورزش جہاد کی تیاری کی نیت سے کرتا ہے، بیوی سے صحبت عفت و پاکدامنی کے لئے یا نیک اولاد کے حصول کی نیت سے کرتا ہے تو اس نیت کی وجہ سے اس کام میں ثواب ملتا ہے اور چونکہ عبادات ہی وہ کام ہیں جو ثواب کے لئے مقرر ہوئے ہیں تو جب نیک نیتی کی وجہ سے مباح کام پر بھی ثواب ملتا ہے تو اس کو بھی مجازاً عبادت کہہ دیتے ہیں۔

امام غزالیؒ کیمیائے سعادت میں فرماتے ہیں۔

''لہٰذا جو شخص اس لئے کھانا کھاتا ہے کہ اس کو علم و عمل پر قوت حاصل ہو اور راہ آخرت پر چلنے کی طاقت میسر ہو اس کا کھانا کھانا عبادت ہے اور اسی کے لئے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مومن کو ہر چیز پر ثواب ہوتا ہے (یعنی جب کہ وہ اس کو شعور کے ساتھ اچھی نیت سے کرے) یہاں تک کہ اس لقمہ پر بھی جو وہ اپنے منہ میں ڈالے یا اپنی بیوی کے منہ میں ڈالے اور آپ ﷺ نے یہ اس لئے فرمایا کہ ان جیسے سب کاموں سے (کامل اور باشعور) مومن کا مقصد راہ آخرت ہوتا ہے''۔

کسی دینی تحریک وجماعت کے سربراہ کے لئے ضروری اوصاف

جو شخص کسی دینی جماعت یا تحریک کا سربراہ ہو خاص طور سے جس جماعت یا تحریک کا نصب العین اجتماعی اصلاح یا انقلاب برپا کرنے کی کوشش ہو تو چونکہ اس نے کار نبوت کو اختیار کیا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس میں کام کے لئے ضروری اوصاف نبوت بھی ہوں۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں۔

ان قام به رجل وحده قتل و لم یصلح للناس امر و لکن ان وجد علیه اعوانا صالحین و رجلا یراس علیهم مامونا علی دین الله لا یحول (احکام القران للجصاص ج2 بحث الامر بالمعروف و النهی عن المنکر)

اگر قوت کے ساتھ حکومت کی برائیوں کو روکنے کے لئے کوئی شخص تنہا کھڑا ہو گا تو وہ تو قتل کر دیا جائے گا اور لوگوں کو کچھ فائدہ نہ ہو گا۔ البتہ یہ صورت ہے کہ اس کام کی سرانجامی میں کچھ اچھے صالح لوگ مددگار بن جائیں اور ان لوگوں کا سربراہ کوئی ایسا شخص ہو جس کے دین پر امن ہو (کہ پورے طور پر راہ حق میں اس نے اتنی ریاضت کرلی ہو کہ) اب اس کے بدلنے (اور اصول و فروع میں راہ حق سے پھلنے) کا اندیشہ نہ ہو۔

اسی طرح امام ابو حنیفہؒ نے جب حضرت زید بن علیؒ کی حمایت کا اعلان کیا تو یوں فرمایا۔

شاهدت زید بن علی کما شاهدت اهله فما رأیت فی زمانه افقه منه ولا اعلم ......)

میں نے زید بن علی کو دیکھا ہے جیسا کہ میں نے ان کے خاندان کے دوسرے افراد کو دیکھا ہے میں نے ان سے بڑھ کر فقیہ اور عالم کوئی نہیں پایا۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ قرآن وحدیث کے بڑے ماہر اور بڑے مجتہد تھے۔ انہوں نے یہ بات بطور ضابطہ کے ذکر کی ہے جو انہوں نے قرآن وحدیث کی روشنی میں معلوم کی۔ وہ ضابطہ یہ ہے کہ کسی دینی تحریک وجماعت کا سربراہ ایسا شخص ہونا چاہیے جو فقیہ وعالم ہو اور اہل حق کو اس کے دین کے بارے میں پورا اطمینان ہو اور ان کو اس کے دین میں راہ حق سے پھسلنے کا کوئی اندیشہ نہ ہو۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک فقیہ وہ شخص ہوتا ہے جس کو نفس کے نفع ونقصان کی باتوں کی معرفت حاصل ہو۔ علاوہ ازیں عمل نہ ہو تو اس کو علم ہی شمار نہیں کیا جاتا اور علم کے بھی صرف اس درجے کا اعتبار ہوتا ہے جو آدمی کے اندر رچ بس جائے اور آدمی کو اپنے تقاضے پورے کرنے پر از خود مجبور کر دے۔

پھر یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ دین کے علم کا سلسلہ تلمذ نبی ﷺ کے دور سے جاری ہے۔ نبی ﷺ سے صحابہ نے سیکھا اور صحابہ سے تابعین نے سیکھا اور تابعین سے تبع تابعین نے سیکھا اور نسل در نسل یہ سلسلہ چلا آیا ہے۔ اسی طر سے دین کی باتوں کے صحیح صحیح مفاہم ومطالب نقل در نقل ہوتے چلے آئے ہیں۔ کوئی شخص دینی علوم مثلاً حدیث، تفسیر اور اصول وغیرہ کی کتابوں کا محض خود ذاتی مطالعہ کر لے تو اس پر اطمینان نہیں ہو سکتا کہ اس نے صحیح مفہوم بھی سمجھا ہے یا نہیں۔ علاوہ ازیں اسی سلسلہ تلمذ میں سے کسی نے اگر سلف صالحین اور خیر القرون کے طریقے کو کسی بھی معاملہ میں ترک کیا تو وہ بدعتی ہے اور اس سے آگے چلنے والا سلسلہ تلمذ قابل اعتبار نہ ٹھہرے گا۔

لہٰذا یہاں فقیہ وعالم سے وہ شخص مراد ہے جس نے علمائے ربانیین سے دین کے اصول وفروع کا مکمل علم حاصل کیا ہو اور ان سے اپنا تزکیہ نفس کرایا ہو اور انہوں نے اس کے علم اور ایمان ودین پر امن واطمینان کا اظہار کیا ہو۔

یہ ضابطہ ہے ان اوصاف نبوت کا جو کہ کار نبوت کے لئے بمنزلہ شرط کے ہیں۔

اگر کسی میں یہ ضابطہ مفقود ہو تو وہ ایسی سربراہی کے لائق نہیں۔ حضرت مولانا یوسف لدھیانویؒ کی عبارت میں مزید وضاحت یوں ہے:

"پس جو شخص کہ علمی رسوخ میں لائق اعتماد نہ ہو جس کا عملی معیار مستند نہ ہو جس نے اہل قلوب اور ارباب باطن کی صحبت میں رہ کر اپنے اخلاق کا تزکیہ اور اپنی باطنی کیفیات کی اصلاح نہ کی ہو اس کے بارے میں یہ کیسے باور کر لیا جائے کہ وہ کسی دینی تحریک کی قیادت کرتے ہوئے نیابت نبوت کے حقوق ٹھیک ادا کر سکے گا اور وہ کسی افراط و تفریط خود رائی و کجروی کا شکار نہیں ہو گا۔ ایک ایسا شخص جس نے علوم نبوت کو کسی ماہر سے نہیں سیکھا جس نے کسی مرد کامل کی صحبت میں رہ کر اپنا تزکیہ باطن نہیں کرایا جس نے لائق اعتماد مشائخ سے حکمت دین کا درس نہیں لیا جس نے کتاب و سنت کے اسرار و حقائق کو کسی جاننے والے سے نہیں سمجھا جس نے اپنے علم و عمل عقائد و نظریات اور سیرت و اخلاق کو اسوہ نبوی میں ڈھالنے کی محنت و ریاضت نہیں کی اور جس کا فہم دین جنگل کی خود رو گھاس ہے (کیا) وہ دینی قیادت کا منصب سنبھال سکتا ہے؟۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

دین میں جن کاموں کے کرنے کو کہا گیا اور وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہیں ان کو معروف یعنی نیکی کہا جاتا ہے اور جو کام ایسے ہیں جن کا کرنا دین میں منع ہے ان کو منکر یعنی برائی کہا جاتا ہے معروف میں فرائض، واجبات سنن اور مستحبات سب داخل ہیں اور منکر میں حرام، مکروہ (تحریمی و تنزیہی) سب داخل ہیں۔

کسی دوسرے کو نیکی کے کام کی تلقین کرنے کو امر بالمعروف کہتے ہیں اور دوسرے کو برائی کے کام سے روکنے کو نہی عن المنکر کہتے ہیں

جب کوئی شخص کسی منکر اور برائی کو ہوتا دیکھے تو اس پر لازم اور فرض ہے کہ وہ اس کو اولاً زبان سے روکے اور نہ مانے تو اپنی قوت بازو سے روک دے مثلاً کسی کو شراب پیتے دیکھا تو اس سے شراب چھین کر بہادے کسی کو موسیقی سنتے دیکھا تو موسیقی کے آلات توڑ دے کسی کو دوسرے کی چیز غصب کرتے دیکھا تو غاصب سے غصب شدہ چیز لے کر واپس دلادے اسی طرح اور برائیوں کو ان کے اپنے طریقے سے روک دے حکمران اور اصحاب اختیار اپنی رعایا اور اپنے ماتحتوں کو اور والد اپنی اولاد کو اپنی قوت بازو سے برائیوں سے روک سکتے ہیں۔

اگر برائی کرنے والا مثلاً زیادہ قوی ہو اور دیکھنے والا اپنی قوت بازو سے برائی سے اس کو نہ روک سکتا ہو تو اپنے قول سے یعنی اس کو وعظ و نصیحت کرکے اور اس کو اس گناہ پر وعید سنا کر اس برائی اور گناہ سے روکنے کی کوشش کرے۔ اور اگر اتنی بھی قدرت نہ ہو اور یہ ڈر ہو کہ زبان سے منع کرنے پر برائی والا مثلاً اس کو قتل کردے گا یا کوئی شدید نقصان پہنچائے گا تو کم از کم دل سے برا سمجھے۔

اسی طرح اگر کسی شخص نے دوسرے کو فرائض وواجبات ترک کرتے دیکھا تو اس

پر لازم ہے کہ ترک کرنے والے کو امر بالمعروف یعنی نیکی کی تلقین کرے یہ فریضہ بھی ہر شخص کی قدرت واستطاعت کے مطابق ہوگا مثلاً کوئی شخص فرض نماز ترک کرتا ہے تو اصحاب حکومت واختیار اس کو قید کر سکتے ہیں اور دیگر اصحاب اختیار بھی اپنے ماتحتوں کو مجبور کر سکتے ہیں اگر کوئی مجبور نہیں کر سکتا تو اس کو نصیحت کر سکتا ہے تو نصیحت ہی کرے اور اگر اس کی بھی قوت نہ ہو تو اس کی نیکی کے ترک کو دل سے برا سمجھے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا تعلق فوری عمل سے ہوتا ہے یعنی کسی کو فرض نماز چھوڑتے دیکھا تو امر بالمعروف یہ ہے کہ کوشش کی جائے کہ وہ اس وقت کی نماز پڑھے اور اگر شراب پیتے دیکھا تو نہی عن المنکر یہ ہے کہ کوشش کی جائے کہ وہ اسی وقت شراب نہ پیئے۔ آئندہ کے لئے وعظ ونصیحت کو دعوت وتبلیغ کہتے ہیں۔

اگر متعدد آدمیوں نے کوئی برائی ہوتے دیکھی یا کوئی نیکی ترک ہوتے دیکھی اور ان میں سے ایک نے نہی عن المنکر یا امر بالمعروف کیا تو باقی لوگوں سے فرضیت ساقط ہو جائے گی لیکن اگر قدرت کے باوجود کسی نے نہ روکا نہ تلقین کی تو سب گنہگار ہوں گے۔

اگر ایک شخص نے برائی ہوتے دیکھی اور وہ خود اس برائی میں مبتلا ہے یا کسی نیکی کا ترک ہوتے دیکھا اور وہ شخص خود اس نیکی کے ترک میں مبتلا ہے تو اس پر دو باتیں لازم ہیں ایک یہ کہ خود اس برائی کو ترک کردے اور دوسری یہ کہ جس شخص کو برائی کرتے دیکھا ہے اس کو بھی منع کرے۔ یاد رہے کہ نیکی کا ترک بھی برائی ہے۔ اگر خود چھوڑنے سے پہلے دوسرے کو منع کرے گا تو یہ بھی درست ہے اور وہ دو ذمہ داریوں میں سے ایک کو پورا کرتا ہے لیکن اس کے لئے مناسب یہی ہے کہ وہ خود بھی فوراً توبہ کرلے۔

فرائض اور واجبات کی تلقین کرنا اور حرام ومکروہ تحریمی سے روکنا فرض ہے جب کہ مستحبات اور نوافل کی تلقین کرنا مستحب ہے۔

مستحبات کی تلقین میں مطلقاً نرمی کرنا چاہیے اور واجبات کی تلقین میں اولاً نرمی اور نہ ماننے پر سختی کرنا چاہیے۔

تنبیہ:۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے ضروری ہے کہ جس بات کی تلقین کرنی ہو اس کا پورا اور صحیح علم تلقین کرنے والے کو حاصل ہو اگر ایسی بات سامنے آئے جس کا خود کو پورا علم نہ ہو تو یا تو پہلے علم حاصل کرلے یا کسی دوسرے صاحب علم شخص کو تلقین کرنے کا کہہ دے۔

مسئلہ

1-اگر غالب رائے یا یقین ہو کہ حق کی تلقین (یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر) کرنے پر لوگ اس کی بات کو قبول کرلیں گے تو اس وقت پر اس حق بات کی تلقین واجب ہے اور اس کا ترک کرنا جائز نہیں۔

2-اگر غالب رائے یا یقین ہو کہ حق کی تلقین پر لوگ اس کو سب وشتم کریں گے یا مار پیٹ کریں گے اور وہ اس پر صبر نہ کر سکے گا تو اس وقت اس کو تلقین نہ کرنا بہتر ہے۔

3-اگر اس کو اطمینان ہو کہ وہ لوگوں کی مار پیٹ وغیرہ برداشت کرلے گا اور کسی سے شکایت نہیں کرے گا تو اس صورت میں حق کی تلقین اور برائی سے روکنے میں کچھ حرج نہیں اور اس کا یہ اقدام جہاد شمار ہوگا۔

4-اگر اندیشہ یا یقین ہو کہ حق بات کی تلقین (یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر) کرنے پر قتل کر دیا جائے گا اور اس کے باوجود اس نے حق کی تلقین کی اور قتل کر دیا گیا تو شہید ہوگا۔

5-اگر غالب رائے یا یقین ہو کہ لوگ اس کی بات نہیں مانیں گے لیکن اس کو لوگوں سے سب وشتم اور مار پیٹ کا اندیشہ بھی نہ ہو تو اختیار ہے چاہے حق کی تلقین کرے چاہے نہ کرے البتہ تلقین کرنا افضل ہے۔

مسئلہ

جب نفع سے ناامیدی کی صورت میں ترک تلقین کو اختیار کرے تو اس وقت یہ

بھی واجب ہے کہ برائی کے ارتکاب کرنے والے سے محبت اور میل جول بھی ترک کردے الا یہ کہ کسی موقع پر سخت ضرورت ہو۔

مسئلہ

حق کی تلقین میں حکمت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے تاکہ مخاطب کی اصلاح ہو۔ یہ نہ ہو کہ مخاطب مزید گمراہی میں پڑ جائے۔

دعوت و تبلیغ

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے ہٹ کر ایک اور شعبہ دعوت الی الخیر یعنی قرآن و سنت کی اتباع کی دعوت دینے کا ہے۔ یہ دعوت کافروں کو بھی ہے اور مسلمانوں کو بھی ہے۔ مسلمانوں کو دین کے عقائد اور احکام و اخلاق کی دعوت ہے اور کافروں کو اسلام و ایمان کی دعوت ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں میں ایک تعداد ایسے لوگوں کی ہو جن کا وظیفہ ہی یہ ہو کہ وہ اپنے قول و عمل سے دنیا کو قرآن و سنت کی طرف بلائیں اور جب لوگوں کو اچھے کاموں میں سست یا برائی میں مبتلا دیکھیں تو اس وقت بھلائی کی طرف متوجہ کرنے اور برائی سے روکنے میں اپنی قدرت کے موافق کوتاہی نہ کریں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو معروف و منکر کا علم رکھنے اور قرآن و سنت سے باخبر ہونے کے ساتھ ذی ہوش اور موقع شناس ہوں، اور یہ وہی ہو سکتے ہیں جو علماء حق ہوں، متبع سنت ہوں، شرک و بدعت سے دور ہوں اور دین کے اصول و فروع سے کماحقہ باخبر ہوں اور نفس کی شرارتوں سے بچتے ہوں۔

ایسے علماء کا وجود خود امت پر اور ہر علاقہ والوں پر فرض کفایہ ہے۔ اگر مسلمانوں کی حکومت اپنی ذمہ داری سے ایسے علماء کی تیاری اور ہر علاقہ میں بقدر ضرورت ان کی فراہمی کا بندوبست کرے تو بہت اچھا ہے ورنہ ہر علاقہ کے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ بقدر ضرورت علماء تیار کریں یا کم از کم کسی دوسری جگہ سے علماء کو بلوا کر اپنے ہاں رکھیں۔ اگر کسی علاقہ کے سب لوگ اس سلسلے میں غفلت کریں تو سب گناہ گار ہوتے ہیں اور اگر ان میں سے کچھ لوگ یہ ضرورت پوری کر دیتے ہیں تو باقی سے فرض ساقط ہو جاتا ہے۔

ہر شہر اور قصبہ میں عام علماء کے علاوہ ضرورت کے بقدر ایسے علماء کا ہونا بھی ضروری ہے جو تمام علوم و شرائع کے ماہر ہوں اور جو اسلام کے عقیدوں اور اسلام کے اصول؛

مسائل کے بارے میں پیدا ہونے والے یا پیدا کئے جانے والے شبہات کا ازالہ کر سکیں اور اشکالات کو حل کر سکیں۔

مسئلہ :۔ علماء کے موجود ہونے کے بعد دعوت الی الخیران کی ذمہ داری ہے جس کی مختلف صورتیں ہیں:

مسلمان عوام کی تعلیم وتربیت

1-اس کے لئے درس کے حلقے قائم کرنا، وعظ کرنا، لوگوں کو دین کے مسائل واخلاق سکھانا، قرآن پاک کی تعلیم کا انتظام کرنا، تزکیہ نفس کی تعلیم دینا یہ سب باتیں دعوت الی الخیر میں داخل ہیں پھر اس کے لئے وہ چاہیں زبانی دعوت دیں خواہ فرد فرد سے یا لوگوں کے اجتماع سے یا تحریر کے ذریعے دعوت دیں یعنی دین کے مختلف احکام سے متعلق کتابیں اور رسالے لوگوں کے لئے لکھیں یہ بھی دعوت ہی کا حصہ ہے۔

2-دعوت الی الخیر کے کام کرنے والی جماعت کے تسلسل کو قائم رکھنے اور محفوظ رکھنے کی تدبیر کرنا۔ چونکہ دعوت کا کام اصل میں علماء کا کام ہے اس لئے دعوت کے کام کو جاری رکھنے کے لئے علماء کو تسلسل سے تیار کرنا بھی ضروری ہے۔اس کے لئے مدارس کو قائم کرنا اور وہاں تعلیم دینا بھی دعوت و تبلیغ کا حصہ ہے اور دینی تعلیم حاصل کرنے والے یہ نیت رکھتے ہوں کہ پڑھنے سے فارغ ہو کر امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور دعوت و تبلیغ کا کام کریں گے تو یہ پڑھنا بھی تبلیغ ہے۔

3-کافروں کو اسلام کی دعوت دینا۔ جن کافروں کو ایک مرتبہ تبلیغ ہو چکی ہو خواہ ان میں اسلام کی شہرت ہو جانے سے ہو ان کو تبلیغ کرنا فرض نہیں البتہ مستحب ہے۔

4-گمراہوں کو راہ حق کی دعوت دینا اور ان کی گمراہیوں اور ان کے شبہات کا جواب دینا۔ علاوہ ازیں جب گمراہ لوگ مسلمان عوام میں اپنی گمراہیاں پھیلانے کی سعی کر رہے ہوں اس وقت مسلمانوں کو گمراہوں کی گمراہی کی حقیقت بتانا اور مسلمانوں کے دین کی حفاظت کی کوشش کرنا ان کو دین پر قائم رکھنا ہے جو دعوت ہی کا ایک حصہ ہے۔

دعوت الی الخیر میں عوام کا کردار

1- مسلمان دین کے احکام واخلاق کے مطابق زندگی گزاریں اور رسول اللہ ﷺ کی سنتوں پر عمل کریں تو ان کی یہی بات بہت سے کافروں کے لئے اسلام میں رغبت کا باعث ہوگی۔

2- علاوہ ازیں وہ اگر کافروں کو اسلام کی دعوت دیں اور دین کی بنیادی اور موٹی موٹی باتیں بتائیں اور دین اسلام کی حقانیت کے کھلے کھلے دلائل سمجھائیں تو وہ ایسا کر سکتے ہیں۔

3- اگر علماء کم ہوں یا علماء تو بہت ہوں لیکن ان کی جانب سے دعوت کے کام میں کوتاہی ہو رہی ہو تو فکر مند علماء دعوت کے کام میں مسلمان عوام سے کام لے سکتے ہیں اس کے لئے ضروری ہے کہ کام لینے والے علماء ہوں اور وہ جن سے کام لیں ان کی ضروری تعلیم وتربیت کریں اور ان کو اس بات کا پابند کریں کہ جتنی بات انہوں نے سیکھی ہے اسی کے دائرہ میں رہ کر دعوت کا کام اور دعوت کی بات کریں اور ادھر ادھر سے لی ہوئی باتوں کو از خود اختیار نہ کریں۔

کافروں کو اسلام کی دعوت دینے میں بھی مسلمان عوام کو ضروری تعلیم تربیت کے بعد ان سے بھی کام لیا جاسکتا ہے۔

دعوت و تبلیغ کے لئے مندرجہ ذیل باتیں ضروری ہیں

1- جتنی دعوت دینی ہے اس کے متعلق ضروری باتوں کا علم حاصل ہو۔

2- اعلاء کلمۃ اللہ اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی نیت ہو۔

3- جس کو دعوت دینی ہو اس کے لئے دل میں ہمدردی اور شفقت کا جذبہ ہو اور اس کو نرمی اور شفقت سے دعوت دے۔

4- دعوت دینے والے میں صبر اور برداشت کی قوت ہونی چاہیے۔

5- دعوت دینے والا خود بھی دین پر عمل پیرا ہو۔

موجودہ حالات میں دعوت و تبلیغ کا کام

ہمارے دور میں سارا نظام ہی بے دینی اور بد دینی پر چل رہا ہے حکومت کا بھی یہی حال ہے اور عام طور سے عوام کی بھی یہی روش ہے۔ بہت سے دین سے تعلق رکھنے والے بھی صرف ایک حد تک دین پر چلتے ہیں اور باقی کاموں میں وہ بھی آزاد ہیں۔ غرض دین مغلوب ہے اور بے دینی و بد دینی کو فروغ حاصل ہے اور اسی کا چرچا ہے۔ لاعلمی اور جہالت بھی عام ہے۔ گمراہیاں بھی اپنے عروج پر ہیں۔ غرض حالات دین کے مقابلہ میں کفر کے زیادہ قریب ہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی جو تفصیل اوپر دی گئی ہے وہ ان حالات میں زیادہ مفید اور موثر نہیں اس لئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فائدہ جہاں اور جتنے درجے تک ہو اس پر تو عمل کرنا ضروری ہوگا البتہ جہاں یہ مفید نہ ہو وہاں دعوت کے طریقے سے کام کرنا ہوگا یعنی نرمی اور شفقت سے سمجھانا اور ان کی ایذاؤں پر صبر کرنا اور ان کو برداشت کرنا۔

علاوہ ازیں عام بے دینی کی فضا میں بہت بڑی تعداد میں کام کرنے والوں کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے مسلمان عوام سے دعوت کا کام لینے کی ضرورت ہے البتہ ان کی ضروری تعلیم و تربیت سے غفلت نہ ہونی چاہیے۔

عورتوں کا امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور دعوت کا کام کرنا

عورتوں کے کام سے متعلق موٹی موٹی باتیں یہ ہیں۔

1- عورتوں پر بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر لازم ہے۔

2- دین کی نشرو اشاعت میں مالی امداد کر سکتی ہیں۔

3- جن کے مرد دعوت کا کام کر رہے ہوں وہ اپنی طرف سے ان کو بے فکر رکھیں اور بچوں کی دیکھ بھال بھرپور طریقے سے کریں۔

4- پاس پڑوس کی بچیوں کو قرآن پاک کی اور ضروری دینی تعلیم دے سکتی ہیں بلکہ پاس پڑوس کی بڑی عمر کی عورتوں کی دینی تعلیم کی فکر کر سکتی ہیں۔

5- کبھی کہیں کچھ عورتیں جمع ہوں خواہ ایک خاندان کی ہوں یا متفرق ہوں کچھ دین کی بات کر سکتی ہیں یا کوئی معتبر کتاب مثلاً فضائل اعمال یا بہشتی زیور یا تحفہ خواتین وغیرہ میں سے کچھ پڑھ کر سنا سکتی ہیں۔

عورتوں کا تبلیغ کے لئے گھر سے نکلنا

حضرت اسماء بنت یزید انصاری صحابیہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرے ماں باپ آپ پر قربان میں مسلمان عورتوں کی طرف سے بطور قاصد کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں۔ بے شک آپ کو اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت دونوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا اس لئے ہم عورتوں کی جماعت آپ پر ایمان لائی اور اللہ پر ایمان لائی لیکن ہم عورتوں کی جماعت مکانوں میں گھری رہتی ہے پردوں میں بند رہتی ہے مردوں کے گھروں میں گڑی رہتی ہے اور مردوں کی خواہشیں ہم سے پوری کی جاتی ہیں ہم ان کی اولاد کو پیٹ میں اٹھائے رہتی ہیں اور ان سب باتوں کے باوجود مرد بہت سے ثواب کے کاموں میں ہم سے بڑھے رہتے ہیں۔ جمعہ میں شریک ہوتے ہیں، بیماروں کی عیادت کرتے ہیں، جنازوں میں شرکت کرتے ہیں، حج پر حج کرتے رہتے ہیں اور ان سب سے بڑھ کر جہاد کرتے رہتے ہیں اور جب وہ حج کے لئے یا عمرہ کے لئے یا جہاد کے لئے جاتے ہیں تو ہم عورتیں ان کے مالوں کی حفاظت کرتی ہیں، ان کے لئے کپڑا بنتی ہیں، ان کی اولاد کو پالتی ہیں، کیا ہم ثواب میں ان کی شریک نہیں؟ رسول اللہ ﷺ یہ سن کر صحابہ کی طرف متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ تم نے دین کے بارے میں اس عورت سے بہتر سوال کرنے والی کوئی سنی۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم کو خیال بھی نہ تھا کہ عورت بھی ایسا سوال کر سکتی ہے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ اسماءؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ غور سے سنو اور جن عورتوں نے تم کو بھیجا ہے ان کو بتا دو کہ عورت کا اپنے خاوند کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا اور اس کی خوشنودی کو ڈھونڈنا اور اس پر عمل کرنا ان

سب چیزوں کے ثواب کے برابر ہے۔ اسماءؓ یہ جواب سن کر نہایت خوش ہوتی ہوئی واپس ہو گئیں (حکایات صحابہ۔ حضرت مولانا محمد زکریا رحمتہ اللہ علیہ)

یہ قصہ اس بارے میں نص صریح ہے کہ عورت کے لئے اصل کے اعتبار سے دین کے نام پر بھی گھر سے نکلنا صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر جائز ہوتا تو سوال کی مناسبت سے رسول اللہ ﷺ یہ ضرور فرماتے کہ تم بھی اللہ کے راستے میں نکل سکتی ہو۔

غرض یہ مردوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے گھر کی عورتوں کی دینی ضروریات کا خیال رکھیں ان کی دینی تعلیم کا اہتمام کریں اور ان کو کوئی بھی مسئلہ پیش آجائے تو علماء سے پوچھ کر ان کو بتائیں۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اس دور کے حالات کی بناء پر عورتوں کو جو نمازوں کے لئے نکلنے کی اجازت تھی آپ ﷺ کے بعد حالات میں تغیر آنے کی وجہ سے وہ نکلنا بھی موقوف ہو گیا تھا اس لئے اصلاً تو تبلیغ کے نام پر بھی عورت کا نکلنا صحیح نہیں اور دعوت و تبلیغ یا جہاد کے لئے نکلنے پر جو فضائل وارد ہوئے ہیں عورتوں سے ان کا براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے کیونکہ ان کے لئے نکلنے کا حکم نہیں ہے بلکہ گھر میں جمے رہنے کا حکم ہے۔

البتہ جب مجبوری ہو کہ عورت کی دینی ضروریات پوری کرنے کی گھر کے مردوں کو فکر نہ ہو تو اس وقت عورت گھر سے خود دین کا مسئلہ معلوم کرنے کے لئے نکل سکتی ہے اور بنیادی دینی تعلیم دینے کی خاطر معلمہ بھی اپنے گھر سے نکل سکتی ہے۔ چونکہ آج کل بے دینی اور غفلت بلکہ بد دینی کا رواج و غلبہ ہے اور بہت سے گھرانوں میں مرد اپنی ذمہ داریوں سے غافل اور بے فکر ہیں اس لئے دین کی بنیادی باتیں سیکھنے سکھانے کے لئے ضرورت کے درجہ میں اگر عورتیں پردے اور حجاب کے پورے آداب کے ساتھ نکلیں خواہ ایک عورت ہو یا چند عورتیں مل کر ہوں تو یہ جائز ہے لیکن چونکہ یہ مجبوری کا نکلنا ہے اس لئے اس میں چند باتوں کی رعایت لازم ہے۔

1۔ دعوت و تبلیغ کے لئے یا علم دین کی طلب کے لئے مستقل نکلنے کی ترغیب نہ دی

جائے اور نہ ہی نکلنے کے فضائل بیان کیئے جائیں کیونکہ ان فضائل کا تعلق عورتوں سے براہ راست نہیں ہے بلکہ اپنے مردوں کے واسطہ سے ہے جیسا کہ اوپر کے قصہ سے معلوم ہوا۔

2- چونکہ نکلنا ضرورت و مجبوری سے ہے لہٰذا نکلنا بقدر ضرورت ہو جہاں مثلاً دو عورتوں کے نکلنے سے کام چل سکتا ہو وہاں ایک بھی زائد عورت نہ جائے۔

3- چونکہ عورتوں کا نکلنا خود اصل مقصد نہیں ہے بلکہ اصل مقصد ایمان و احکام کو سیکھنا ہے اس لئے اس دوران بھی اور آئندہ کے لئے بھی عورتوں کی بنیادی دینی تعلیم کا بندوبست ہونا چاہیے۔ پھر جو عورتیں اتنا کچھ سیکھ جائیں وہ بلاوجہ کے ہر قسم کے پروگراموں میں شریک نہ ہوں بلکہ اپنے گھر میں رہتے ہوئے پاس پڑوس کی عورتوں اور بچیوں میں محنت کریں تاکہ زیادہ عورتوں کو نکلنے کی ضرورت نہ پڑے۔

4- عورتوں کے بڑے اجتماع سے مکمل اجتناب ہو محلّہ کی سطح پر بھی جو اجتماع ہو وہاں بھی پرانی سیکھی ہوئی عورتیں بقدر ضرورت شریک ہوں ہر ایک اس میں شریک ہونے کو اپنی ذمہ داری سمجھے یا بڑی فضیلت کی چیز سمجھے یہ فکر غلط ہے محلّہ کی سطح پر بھی چھوٹا اجتماع ہو تاکہ لوگوں کو کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آئے۔

5- دین کا کام کرنے کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ ایک میاں بیوی جن کو ضرورت کی دینی تعلیم دی گئی ہو وہ کسی محلّہ میں جا کر دس پندرہ دن یا کم و بیش ٹھہر جائیں اور محلّہ کی عورتیں ان خاتون سے آکر دین کے احکام اور فضائل سیکھیں۔

6- دین کے نام پر عورتیں مظاہرہ کریں یا جلسہ کریں یا جلوس نکالیں یہ غیر شرعی حرکت ہے۔

بالغ لڑکیوں کے دینی مدارس

قریب البلوغ اور بالغ لڑکیوں اور عورتوں کو بھی بنیادی دینی تعلیم سیکھنا ضروری

ہے۔اس سے زائد تعلیم حاصل کرنا کہ عربی زبان بھی سیکھیں اور دین کا پورا علم حاصل کریں ان پر ضروری نہیں ہے نہ اس کا سیکھنا ان پر ضروری ہے اور نہ ہی اس کا سکھانا ان پر ضروری ہے۔ اگر اپنے گھر کے مردوں سے سیکھنے کا موقع مل جائے تو بہت ہی اچھا ہے ورنہ اس غیر ضروری کام کے لئے گھر سے نکلنا جائز نہیں۔

علاوہ ازیں اس عمر میں گھر میں قرار پکڑنے کی عادت ڈلوانا ضروری ہے۔ اگر اسی عمر میں چار پانچ سال کے لئے روز مدرسہ آنے جانے کی عادت رہے گی تو آئندہ عمر میں گھر میں جمے رہنا مشکل ہوگا اور پھر خصوصاً ہمارے علاقوں میں بہت سے دینی و معاشرتی مسائل پیدا ہوں گے جن کا کچھ نہ کچھ مشاہدہ اب بھی ہونے لگا ہے۔

تنبیہ: 1- عام طور پر یہ سوچا جاتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں لڑکیاں اگر مدرسہ میں نہیں جائیں گی تو کالج میں جائیں گی کیونکہ انہوں نے گھر میں تو مقید رہنا نہیں ہے پھر کیوں نہ مدرسہ میں ہی جائیں جہاں وہ دین کے بہت سے احکام پر عمل کرنا سیکھ لیتی ہیں اور اس طرح ایک بڑے پیمانے پر واضح تبدیلی نظر آنے لگی ہے۔ لڑکیوں کے مدارس بند کر دیئے جائیں تو ان کے بہت سے فوائد سے محرومی ہو جائے گی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ بہت سے دیندار لوگ اپنی لڑکیوں کو کالجوں میں تو بھیجتے ہی نہیں تھے اور جو بھیجتے تھے ان کے ہاں اس کی وجہ سے اگر کوئی مسئلہ پیدا ہوتا تھا تو وہ بھی اور دوسرے لوگ بھی اس کو اپنی غلطی کا نتیجہ سمجھنے پر مجبور ہوتے تھے۔ مدارس کے نام پر بہت سے دینداروں نے بھی اپنی لڑکیاں بھیجنی شروع کر دی ہیں۔ اب اگر کوئی مسائل اٹھیں گے تو ظاہر ہے کہ اس کی زد دین پر پڑے گی۔

2- کسی کام یا نظام میں خرابی ہونے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس سے منسلک تمام افراد میں وہ خرابی نظر آئے۔ چند افراد میں خرابی کا پیش آنا اس کام کے غلط ہونے کے لئے کافی ہے جب کہ وہ کام فرض یا واجب نہ ہو۔

دعوت و تبلیغ کے بارے میں چند غلط فہمیوں کا ازالہ

پہلی غلط فہمی

بعض حضرات کا خیال ہے کہ دعوت کے کام کو چھوڑے ہوئے تیرہ سو سال ہو گئے اور اس کے منافع اور اس کی عظمت اور اس کی ضرورت اور اس کا طریقہ اور اس کے اصول اور اس کا اسلوب اس وقت اہل زمانہ کے دماغوں سے سب مجہول ہو گئے۔ ہر ایک اپنے اپنے علم و فہم کے اعتبار سے جو صحابہؓ کے علم و فہم سے جداگانہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج سے بہت دور ہے اپنی اپنی رائے زنی کرتے ہوئے دعوت کی ضرورت کو بیان کرتا ہے حالانکہ دعوت علم کے اعتبار سے جو عمل سے علیحدہ ہو گیا ہے سمجھنا بہت مشکل ہے۔ حضرت مولانا الیاسؒ پر حق تعالیٰ نے خصوصیت سے وہ کچھ کھولا جو دوسرے علماء پر نہیں کھولا اس لئے اس کام کے کسی عمل کو علمی دلائل سے سمجھانا صحیح نہیں۔

یہ خیال بہت سی غلطیوں پر مشتمل ہے۔

غلط فہمی کا ازالہ

دعوت و تبلیغ کے بارے میں تفصیل ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ یہ کہا جائے کہ امت تیرہ سو سال سے دعوت کے کام کو سرے سے بھولی رہی اور اس کے اصول و آداب اور اسلوب و ضرورت سب دماغوں سے محو ہو گئے تو یہ امت پر بہت بڑا الزام ہے۔ دعوت و تبلیغ بھی دین کا ایک حصہ ہے اور دین کی حفاظت کا ذمہ اللہ نے لے رکھا ہے لہٰذا یہ بات کبھی درست نہیں ہو سکتی۔ ہاں ہر دور کے اعتبار سے دعوت کی صورتیں مختلف رہیں۔ مسلم معاشرہ میں وعظ و نصیحت اور تعلیم و تربیت کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوا۔ صوفیاء بھی اصلاح و ارشاد کا کام کرتے رہے ہیں اور کتنے ہی ممالک

میں بہت بعد کے زمانے میں اسلام پھیلا ہے۔ تاتاریوں میں اسلام آیا تو وہ بھی آخر کسی کی دعوت ہی کا اثر تھا۔ ہندوستان میں مغل بادشاہ اکبر کے زمانے کی بددینی حضرت مجدد صاحبؒ کی داعیانہ کوششوں کی بدولت ہی ختم ہوئی۔ احمد شاہ ابدالی کو حضرت شاہ ولی اللہؒ کی دعوت ہی مرہٹوں کے خلاف میدان میں لائی۔ انگریزوں کے مکمل تسلط کے بعد دار لعلوم دیوبند نے اپنا کام کیا جو کہ دعوت ہی کا کام تھا۔ یورپ والوں اور انگریزوں کی واپسی کا دور شروع ہونے لگا تو مسلمان ملکوں میں جو طبقہ برسر اقتدار آتا تھا وہ کہنے کو تو اگرچہ مسلمان تھا لیکن مغربی آقاؤں کا فکر اور عمل دونوں طرح سے مکمل غلام تھا۔ مغرب والوں کو دین کے نام پر ٹکرانے کی مزید سکت نہ تھی۔ لیکن ان غلام حکمرانوں کو یہ اطمینان تھا کہ ہم بھی مسلمان ہیں اور اسلام بس وہی ہے جو ہم نے سمجھا ہے لہٰذا دین کے نام پر ہمارا مقابلہ کرنے والے قابل گردن زنی ہیں۔ مصر اور بعض دیگر ملکوں میں اس کا مشاہدہ بھی ہو چکا ہے کہ نئے مسلم حکمرانوں نے دینی قوتوں سے اپنے فائدے نکالے اور پھر ان کو پوری طرح کچلنے میں مصروف ہو گئے اور دھوکہ د فریب اور ظلم و بربریت میں اپنے مغربی آقاؤں سے بھی آگے بڑھ گئے۔

ایسے حالات میں جب کہ ساری قوت نئے حکمرانوں کے ہاتھوں میں مرتکز ہونے والی تھی اور مغربی دنیا کی ان کو مکمل پشت پناہی حاصل ہونی تھی اور بے دینی اور بددینی کو پھیلانے کی بھرپور کوششیں ہو رہی تھیں اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا الیاسؒ کو یہ طریقہ الہام فرمایا تاکہ ظاہری کشمکش سے بچتے ہوئے ایمان و یقین کی دعوت چلے اور بحمد اللہ اس طریقے سے بہت فائدہ ہوا اور ہو رہا ہے۔

حضرت مولانا الیاسؒ نے خواب میں دیکھا تھا کہ ان سے کہا گیا کہ ہم تم سے کام لیں گے۔ یہی کچھ واقعہ ان سے پہلے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور ان سے بھی پہلے حضرت سید احمد شہیدؒ کے ساتھ پیش آچکا تھا۔ ان حضرات کے کام بھی الہامی تھے۔ اگر حضرت مولانا الیاسؒ کا طریقہ ہی ضروری تھا تو ان حضرات کو اس کے خلاف

کیوں الہام ہوا۔ بات وہی ہے جو ہم نے ذکر کی اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دور میں دعوت کے جس طریقہ کی ضرورت تھی اللہ تعالیٰ نے خصوصیت سے اس کو حضرت مولانا الیاسؒ پر کھولا اور ان کو اس کے آداب واصول کو نصوص سے استنباط کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ ایسا نہیں ہوا کہ ان کو ماوراء نصوص کوئی نئی باتیں الہام ہوئی ہوں۔ اس استنباط واجتہاد میں وہ معصوم نہیں تھے اگر ان کی کوئی بات نصوص کے خلاف ہو گی تو اصولی طور پر وہ قابل اصلاح ہو گی۔

تنبیہ: اس دور میں بھی دین کے اور شعبوں میں کام اسی طرح ضروری ہے جس طرح دعوت و تبلیغ کا کام ضروری ہے۔ احقاق حق اور ابطال باطل، ظالم حکمرانوں کے سامنے کلمہ حق کہنا، دینی تعلیم میں انہماک، نئے مسائل کی تحقیق کرنا، ضرورت کی دینی کتابیں تصنیف کرنا، لوگوں کے تزکیہ باطن کی فکر کرنا یہ سب دین کے شعبے ہیں کسی شعبہ کو خالی نہیں چھوڑا جا سکتا لہٰذا اللہ تعالیٰ جسکو جس کام کی توفیق دیں وہ اس میں محنت کرے تقابل کرنا اور کسی ایک شعبہ کو دوسرے سے برتر یا کمتر سمجھنا حد سے تجاوز کرنا ہے۔

دوسری غلط فہمی

ایک خیال یہ ہے کہ یہ امت ختم نبوت کی بناء پر نیابت نبوت کے لئے مبعوث ہوئی ہے اور منتخب کی گئی ہے اس کے دلائل یہ ہیں۔

حدیث من رای منکم منکرا فلیغیره بیده (جو کوئی تم میں سے کوئی برائی ہوتے دیکھے تو اس کو اپنی قوت بازو سے روک دے) میں امت کا ہر ہر فرد مخاطب ہے کسی قسم کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ اسی طرح منکر مع التنوین بھی عام ہے کوئی بھی منکر ہو ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے اور وہ اس کے تغیر میں لگنے کا مامور ہے اور اپنی قوت بازو سے اس کے بدلنے کا مکلف ہے۔ اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو پھر اس سے کمتر درجہ زبان سے کہنے کا اور اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے برا سمجھنے کا ہے۔ اسی طریقہ پر

بلغوا عنی ولو آیة میں ہر ہر امتی اس تبلیغ کا مکلّف ہے آپ ﷺ نے صراحت کے ساتھ اپنی ذمہ داری بطور امانت امت کی طرف منتقل فرمائی اور ہر ہر امتی کو مکلّف فرما دیا۔

غلط فہمی کا ازالہ

یہ خیال دو باتوں پر مشتمل ہے۔

1-امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور دعوت و تبلیغ کے کام کا ہر ہر امتی مکلّف ہے۔

2-امت کے افراد کی یہ ذمہ داری ختم نبوت کی بناء پر ہے۔

یہ دونوں باتیں محل نظر ہیں

1- دعوت و تبلیغ کی شرعی حیثیت

قرآن پاک میں ہے

وَ لْتَكُنْ مِنْكُمْ اُمَّةٌ يَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران: 104)

"اور چاہیے کہ رہے تم میں ایک جماعت ایسی جو بلاتی رہے نیک کام کی طرف اور حکم کرتی رہے اچھے کاموں کا اور منع کرے برائی سے"

اس آیت میں واضح طور سے فرمایا کہ دعوت کا کام مسلمانوں کی ایک جماعت کے ذمہ ہے اور اس جماعت سے مراد وہ حضرات ہیں جن کو قرآن و سنت کا پختہ علم حاصل ہو ہر ہر شخص کا یہ کام نہیں۔

ایک حدیث یہ ہے۔

عَنِ ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ من آمن بالله و رسوله و اقام الصلاة و صام رمضان كان حقاعلي الله ان يدخله الجنة جاهد في سبيل الله او جلس في ارضه التي ولد فيها (بخاری)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس شخص نے اللہ اور

اس کے رسول پر ایمان رکھا اور نماز قائم کی اور رمضان کے روزے رکھے تو اللہ پر حق ہے کہ اس کو جنت میں داخل کرے خواہ اس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہو یا وہ اپنی اسی جگہ پر نکا رہا ہو جہاں وہ پیدا ہوا۔

اس حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ جہاد ہو یا دعوت کا کام ہو ہر امتی پر یہ فرض نہیں ہے کیونکہ جب وہ اپنی بستی ہی میں بیٹھا رہا تو اس نے دوسروں تک دین پہنچانے کی فکر بھی نہیں کی۔ اگر یہ اس پر بھی فرض ہوتا جیسا کہ نماز روزہ ہر امتی پر فرض ہیں تو اس کو نہ کرنے پر گرفت کا اندیشہ ہونا چاہیے تھے۔

ایک اور آیت ہے

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ

"آپ کہہ دیجئے یہ میری راہ ہے۔ بلاتا ہوں اللہ کی طرف سمجھ بوجھ کر میں اور جس نے میری پیروی کی"۔

اس آیت کا یہ مطلب لیا جائے کہ جو میری پیروی کرنے والے ہیں وہ بھی (اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتے ہیں) تو اس سے بھی ہر ہر امتی کا مکلف ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ یہ ایک خبر ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے پیروکار دعوت کا کام کرتے ہیں۔ اگر یہ مطلب لیں کہ آپ کا ہر ہر پیروکار دعوت کا کام کرتا ہے تو یہ خبر خلاف واقعہ ٹھہرتی ہے کیونکہ مسلمانوں کی خاصی تعداد دعوت کا کام نہیں کرتی حالانکہ قرآن کی خبر تو غلط نہیں ہو سکتی لہٰذا یہ ماننا پڑے گا کہ یہاں خاص قسم کے پیروکار مراد ہیں جو قرآن و سنت کا وافر علم رکھتے ہیں اور ان کو بصیرت بھی حاصل ہے۔ ہر ہر مسلمان مراد نہیں ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

چونکہ اس آیت میں امت مسلمہ سے خطاب ہے اور بتایا گیا کہ وہ لوگوں کے نفع کے لئے نکالی گئی ہے تو یہاں الناس سے وہ لوگ مراد ہیں جو ابھی تک ملت کفر میں ہیں

اور یہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے ایمانیات کو اختیار کرنے اور کفریات کو ترک کرنے کی تلقین مراد ہے غرض یہاں مراد دعوت و تبلیغ ہے۔

اس آیت میں بھی امت مسلمہ مجموعی طور پر مراد ہے اس کا ہر ہر فرد مراد نہیں ہے کیونکہ یہاں خیر امت ہونے کی خبر دی گئی ہے اگر ہر ہر فرد کے خیر اور بہترین ہونے کا مطلب لیں تو مشاہدہ اس کے خلاف ہے اور چونکہ قرآن کی خبر تو غلط نہیں ہو گئی لہذا امت کو بحیثیت مجموعی مراد لینا ضروری ہو گا۔

حدیث میں ہے بلغوا عنی ولو آیة (میری طرف سے پہنچاؤ اگرچہ ایک ہی آیت ہو)

اوپر ذکر کیے گئے قرآن و حدیث کے دلائل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ دعوت و تبلیغ کا کام امت کے ہر ہر فرد کے ذمہ نہیں ہے اگر اس حدیث کی رو سے یہ کہا جائے کہ ہر ہر امتی اس تبلیغ کا مکلف ہے اور نبی ﷺ نے صراحت کے ساتھ ہر ہر امتی کو اس کا مکلف فرمادیا تو جاننا چاہیے کہ یہ حدیث خبر واحد کے درجہ میں ہے اور خبر واحد کے درجہ والی حدیث سے قرآن کے کسی حکم کی صورت کو تبدیل نہیں کیا جاسکتا۔

مسلمانوں (اور ذمیوں) میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر

دعوت و تبلیغ کے مقابلہ میں ان کے کرنے والوں کا دائرہ زیادہ وسیع بتایا ہے اس کی دلیل ہے حدیث من رای منکم منکرا فلیغیره بیده (جو کوئی تم میں سے برائی ہوتے دیکھے تو اس کو اپنی قوت بازو سے بدل ڈالے یعنی روک دے)

لیکن اس حدیث سے بھی امت کا ہر ہر فرد مراد لینا اور دنیا جہان کا کوئی بھی منکر ہو وہ مراد لینا درست نہیں بلکہ الفاظ اس بارے میں صریح ہیں کہ فقط وہ امتی مراد ہے جو برائی کو ہوتا ہوئے دیکھے یا اس کے علم میں آئے کہ فلاں جگہ میں منکر ہو رہا ہے اور وہاں کے لوگوں نے اس کو روکنے کی کوشش نہیں کی اور اس کو وہاں تک پہنچنے کی آسانی ہو اور وہ اس برائی کو روکنے پر اپنے اندر قدرت بھی پاتا ہو۔

پھر دیکھنے اور علم رکھنے والوں میں سے اگر کسی ایک نے بھی برائی کرنے والے کو برائی سے روک دیا تو باقی سب سے حکم ساقط ہو جاتا ہے اور اگر کسی کو روکنے کی ہمت نہ ہو لیکن کسی ایک نے زبان سے ان کو فہمائش کر دی اور وہ باز نہیں آیا اور مزید کہنے سننے سے فائدہ کی توقع نہ ہو تو باقی سب لوگ دل میں اس کو برا جانیں تو اس سے بھی حکم پر عمل ہو جاتا ہے۔

اہم تنبیہ

دعوت و تبلیغ کی شرعی حیثیت بتانے کا یہ مطلب نہیں کہ اب عوام مسلمان مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں بلکہ اس سے غرض فقط یہ ہے کہ نصوص یعنی آیات واحادیث سے مطالب اخذ کرنے میں جو غلطی کی جارہی ہے اس سے بچا جائے اور صحیح دلائل کو اختیار کیا جائے۔ اس کو ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں دعوت کا اصل کام علماء کی ذمہ داری ہے البتہ جب کام کے تقاضوں کے مطابق علماء کی تعداد کم ہو تو عوام کو مناسب تربیت دے کر ان سے بھی کام لے سکتے ہیں اور اس دور میں چونکہ دین مغلوب ہے اور کفر و فسق خوب پھیلا ہوا ہے اس لئے زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو اس کام میں لگنے کی ضرورت ہے بلکہ حالات کا تقاضا ہے کہ سب ہی مسلمان اپنے کچھ اوقات کو بھی فارغ کریں اور مالی قربانی بھی دیں اور دین کے جس شعبہ سے ان کو مناسبت ہو اس میں اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ لگائیں۔

2- یہ کہنا کہ یہ امت ختم نبوت کی بناء پر نیابت نبوت کے لئے مبعوث ہوئی ہے درست نہیں کیونکہ اگر یہ بات اس خیال پر مبنی ہے کہ پچھلی امتوں پر دعوت اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری نہیں تھی تو یہ بات نصوص کے خلاف ہے۔ قرآن پاک میں اصحاب سبت کا ذکر ہے یعنی وہ لوگ جن کو ہفتہ کے دن مچھلی کے شکار سے منع کیا گیا تھا لیکن انہوں نے شکار کے حیلے بہانے ایجاد کر کے نافرمانی کا ارتکاب کیا۔ ان کو کچھ لوگوں نے ایسا کرنے سے منع کیا لیکن وہ باز نہ آئے باقی کچھ لوگوں نے ان منع کرنے

والوں کو کہا کہ تم ان لوگوں کو جن کو اللہ نے ہلاک کرنا ہے یا عذاب دینا ہے کیوں نصیحت کرتے ہو۔ مطلب یہ تھا کہ یہ ماننے پر تیار نہیں ہیں تو ان کو مزید نصیحت کرنا بھی چھوڑ دو ان لوگوں نے جواب دیا کہ ہمارا یہ نصیحت کرنا اللہ کے نزدیک ہمارا عذر بن جائے گا کہ ہم نے نہی عن المنکر کی اپنی ذمہ داری پوری کر دی تھی۔

اسی طرح قرآن پاک میں امتوں میں دعوت کے واقعات بھی مذکور ہیں سورہ مومن میں آل فرعون میں سے ایمان قبول کرنے والے ایک شخص کا طویل دعوتی بیان مذکور ہے۔ اسی طرح سورہ بروج میں اصحاب اخدود کا ذکر ہے جو ایک راہب کی شاگردی کرنے والے لڑکے کی بدولت مسلمان ہوئے۔ اس لڑکے کا لوگوں کو اسلام کی دعوت دینا صحیح مسلم میں مذکور ہے پھر خود وہ لڑکا بھی تو راہب کی دعوت سے مسلمان ہوا۔ حضرت عیسیٰؑ کے حوارین کی دعوت و تبلیغ سے آپ کا دین پھیلا جو کہ تاریخ سے ثابت ہے۔ اور اگر یہ بات اس خیال پر مبنی ہے کہ یہ امت پوری دنیا کے لئے نکالی گئی ہے تو اس کا سبب ختم نبوت نہیں بلکہ نبی ﷺ کی نبوت کا عالمی ہونا ہے۔

ختم نبوت کی وجہ سے اس امت کو جو فضلیت اور ذمہ داری حاصل ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اس امت کے علماء کو بنی اسرائیل کے انبیاء کے ساتھ تشبیہ دی گئی کہ ان کا بھی وہی کام ہے جو ان انبیاء کا تھا۔ دوسرے اس امت میں مجددین کا سلسلہ چلا ہے کہ گمراہوں نے دین میں خرابی پیدا کرنے کی جو کوششیں کی ہوں ان کے اثرات کو یہ مجددین دور کریں اور دین کو خالص کریں۔

جہاد

دین کی سر بلندی اور کفار کی شوکت توڑنے کے لئے کفار سے جو مقابلہ کیا جائے وہ جہاد ہے۔ کوئی جان لے کر مقابلہ پر آجائے تو جانی جہاد ہے اور مال لگائے تو مالی جہاد ہے۔ کوئی اور اگر مفید جنگی مشورہ دے یا صرف مسلم فوج کی نفری بڑھانے کی خاطر شمولیت کرے تاکہ زائد نفری کا بھی دشمن پر رعب پڑے تو یہ بھی جہاد کا حصہ ہے۔ سرحدوں کی نگرانی اور حفاظت کرنا بھی جہاد ہے۔

ابتداءً جہاد کرنا (یعنی اگرچہ کافروں نے حملہ کرنے میں پہل نہ بھی کی ہو) فرض کفایہ ہے۔ البتہ اگر اس علاقے میں مسلمان اتنے تھوڑے ہوں کہ سب کے نکلے بغیر جہاد نہ ہو سکتا ہو تو یہ سب پر فرض عین ہو جاتا ہے۔ جہاد کی اس فرضیت کا ہر علاقے میں علیحدہ علیحدہ اعتبار ہوگا۔ مشرقی یورپ میں جہاد سے پاکستان میں جہاد کا حکم ختم نہیں ہوگا۔ غرض حکم یہ ہے کہ جہاد ہر وقت چلتا رہے خواہ کفار پہل کریں یا نہ کریں حدیث میں ہے **الجهاد ماض منذ بعثنی الله الی ان یقاتل آخر امتی الدجال لا یبطله جور جائر و لا عدل عادل** (جب سے اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث کیا ہے اس وقت سے لے کر میری آخری امت کے دجال سے جنگ کرنے تک جہاد چلتا رہے گا کسی ظالم کا ظلم اور کسی عادل کا عدل اس کو ختم نہیں کر سکے گا۔

مسئلہ:۔ ایک شخص جہاد کا عزم رکھتا ہے لیکن دیگر لوگوں کے آمادہ نہ ہونے کی وجہ سے یا ان کے سستی کرنے کی وجہ سے یا حکمرانوں کے رکاوٹ ڈالنے کی وجہ سے نہیں نکل سکتا تو وہ گناہ گار نہیں ہوگا۔

مسئلہ:۔ جب مسلمان کفار کا محاصرہ کرلیں تو اگر ان کو اسلام کی دعوت نہ پہنچی ہو تو ان کو پہلے اسلام کی دعوت دینا واجب ہے اور اگر پہنچ چکی ہو تو مستحب ہے۔ اگر وہ اسلام قبول کرلیں تو فبہا ورنہ ان کو جزیہ کی ادائیگی قبول کرنے اور مسلمانوں کی ماتحتی

قبول کرنے کی دعوت دیں۔ اگر وہ اس کو قبول کرلیں تو ان کو مسلمانوں کے مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ اگر کافر اس کو بھی قبول نہ کریں تو پھر مسلمان ان سے جنگ کریں۔

مسئلہ:۔ اگر کبھی مسلمان مغلوب ہو جائیں اور ہتھیاروں سے مقابلہ کرنا ممکن نہ ہو تو مقابلہ کرنے اور احتجاج کرنے اور اپنے مطالبات منوانے کے جو بھی ذرائع ممکن ہوں ان کو اختیار کرنا ضروری ہوگا اور اس وقت یہی ذرائع بمنزلہ ہتھیار کے ہوں گے۔

تنبیہ: 1۔ بعض لوگوں کو یہ وہم ہوا ہے کہ اصل چیز تو دعوت ہے کافروں کو بھی پرامن طریقے سے دعوت اسلام دی جائے۔ اگر وہ اس میں اس درجہ مزاحم ہوں کہ جنگ کرنے پر آجائیں تو اب مسلمان مدافعانہ طور پر ان سے جنگ کریں۔ یہ سوچ بالکل غلط ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے پہلے کفار حکمرانوں کو دعوتی خطوط بھیجے جب انہوں نے دعوت قبول نہ کی تو ان کی طرف لشکر روانہ کیے۔ خلفائے راشدین کا عہد تو اس کی منہ بولتی تصویر ہے کہ اس میں کفار کے خلاف مستقل لشکر کشی جاری رہی۔

2۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ کے دور میں جہاد کا لفظ بول کر اس سے کفار کے ساتھ جنگ اور لڑائی کا معنیٰ ہی سمجھا جاتا تھا جس کے دلائل یہ ہیں۔

i۔ عن ابی قتادة ان رسول الله ﷺ قام فیهم فذکرلهم ان الجهاد فی سبیل الله والایمان بالله افضل الاعمال فقام رجل فقال یا رسول الله ارایت ان قتلت فی سبیل الله یکفر عنی خطایا ی فقال رسول الله ﷺ نعم ...الخ

حضرت ابو قتادہؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ صحابہ کے درمیان کھڑے ہوئے اور ان سے ذکر کیا کہ اللہ کی راہ میں جہاد اور اللہ پر ایمان سب سے افضل اعمال ہیں۔ اس پر ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا یارسول اللہ یہ بتایئے کہ اگر میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں تو میرے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے آپ نے فرمایا کہ ہاں۔۔۔۔ (مسلم)

آدمی لڑائی اور جنگ میں قتل ہوتا ہے ان صاحب نے جہاد سے لڑائی اور جنگ کا معنی سمجھا۔

ii- عن عبداللہ بن عمر قال جاء رجل الی رسول اللہ ﷺ فاستاذنہ فی الجهاد فقال احی والداك قال نعم قال ففيهما فجاهد (بخاری و مسلم)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں ایک شخص رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور آپ سے جہاد میں جانے کی اجازت مانگی آپ نے پوچھا کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟ اس شخص نے جواب دیا کہ جی ہاں۔ آپ نے فرمایا تو تم ان کی خدمت کا کام کرو۔

ان صاحب نے جس جہاد میں جانے کی اجازت مانگی وہ کافروں کے ساتھ جنگ ہی تھی۔

iii- حضرت ابو بکرؓ نے اہل یمن کو یہ تحریر بھیجی۔

اما بعد فان اللہ تعالیٰ کتب علی المومنین الجهاد و امر هم ان ينفروا خفافا و ثقالا و يجاهدوا باموالهم و انفسم فی سبيل اللہ و الجهاد فريضة مفروضة والثواب عند اللہ عظيم (حیاۃ الصحابہ: باب الجهاد)

حمد و صلاۃ کے بعد یہ کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مومنین پر جہاد فرض کیا اور ان کو حکم دیا کہ وہ ہلکے اور بوجھل نکلیں اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔ اور جہاد لازم کیا ہوا فرض ہے اور اس کا ثواب اللہ کے ہاں بہت بڑا ہے۔

iv- **وَ لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ** کے بارے میں حضرت ابو عمرانؒ کہتے ہیں کہ حضرت ابوایوب انصاریؓ نے فرمایا۔

فالالقاء بايدينا الى التهلكة ان نقيم فی اموالنا و نصلحها و ندع الجهاد قال ابو عمران فلم يزل ابوايوب يجاهد فی سبيل اللہ حتیٰ دفن بالقسطنطنيه (بیهقی. حیاۃ الصحابہ)

اپنے ہاتھوں ہلاکت میں ڈالنا یہ ہے کہ ہم اپنے اموال میں ٹھہر جائیں اور ان کی دیکھ بھال میں لگ جائیں اور جہاد کو ترک کر دیں حضرت ابو عمرانؒ کہتے ہیں اسی وجہ سے

حضرت ابوایوب انصاریؓ اللہ کی راہ میں جہاد اور جنگ کرتے رہے یہاں تک کہ (جہاد ہی کے دوران وفات پاکر) قسطنطنیہ میں دفن ہوئے۔

غرض جہاد کا لفظ جنگ اور لڑائی کے معنی میں حقیقت شرعی ہے اور قرآن و حدیث کی دیگر نصوص میں جہاد کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے مثلاً

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ

"کیا تم کو خیال ہے کہ داخل ہو جاؤ گے جنت میں اور ابھی تک معلوم نہیں کیا (انکو) جو لڑنے والے ہیں تم میں اور معلوم نہیں کیا (ان کو جو) ثابت قدم رہنے والے ہیں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (انفال: 72)

"جو لوگ ایمان لائے اور گھر چھوڑا اور لڑے اپنے مال اور جان کے ساتھ اللہ کی راہ میں"۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَاۤؤُكُمْ وَ اَبْنَاۤؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ (توبہ: 24)

"تو کہہ دے اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور برادری اور مال جو تم نے کمائے ہیں اور سوداگری جس کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو اور حویلیاں جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو زیادہ پیاری ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور لڑنے سے اس کی راہ میں تو انتظار کرو یہاں تک کہ بھیجے اللہ اپنا حکم"۔

اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّ ثِقَالًا وَّ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

(توبہ: 41)

"نکلو ہلکے اور بوجھل اور لڑو اپنے مال اور جان سے اللہ کی راہ میں"۔

البتہ کہیں کہیں لغوی معنی کے اعتبار سے جہاد کا لفظ مشقت کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور موقع کے قرائن اس معنی کی تعیین کرتے ہیں مثلاً۔

ایک موقع پر غزوہ سے واپس آتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

رجعنا من الجهاد الاصغر الى الجهاد الاكبر

(مشقت کے اعتبار سے) ہم چھوٹے جہاد سے (یعنی جنگ سے جس میں مشقت عارضی ہوتی ہے) بڑے جہاد کی طرف پلٹے ہیں (یعنی مجاہدہ نفس کی طرف جو مسلسل چلتا رہتا ہے)۔

فی سبیل اللہ

ملا علی قاریؒ مرقات میں لکھتے ہیں۔

هو فى الحقيقة كل سبيل يطلب فيه رضاه فيتناول سبيل طلب العلم و حضور صلاة جماعة و عيادة مريض و شهود جنازة و نحو ها لكنه عند الاطلاق يحمل على سبيل الجهاد (7:271)

ویسے تو یہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے ہر رستے کو کہتے ہیں لہٰذا طلب علم اور نماز با جماعت اور مریض کی عیادت اور نماز جنازہ میں شرکت یہ سب ہی سبیل اللہ میں شامل ہیں البتہ جب اس کو مطلق ذکر کیا جائے تو اس سے مراد جہاد اور کفار سے جنگ کی راہ مراد ہوتی ہے۔

لہٰذا جہاں فی سبیل اللہ کے ساتھ جہاد یا قتال کا لفظ ہو وہاں تو اس سے متعین طور پر جنگ ہی مراد ہے اور جہاں مطلق ذکر ہو وہاں بھی اس کو جنگ پر محمول کریں گے اور جہاں کہیں عام معنی مراد لے سکتے ہیں وہاں مذکورہ بالا تمام صورتیں شامل ہیں یعنی طلب علم، حج، نماز با جماعت، مریض کی عیادت، باطل فرقوں سے مناظرہ، حکومت و

سیاست کی اصلاح کی کوشش، تعلیم وتدریس اور دعوت تبلیغ۔

تنبیہ : جہاد شروع کرنے کے لئے مقصد، افراد، وسائل اور طریق کار پر خوب غور وفکر کر لینا چاہیے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ فرماتے ہیں کتنے لوگوں نے صلاح دی کہ اس ملک (یعنی ہندوستان) میں جہاد کر جو کچھ مال خزانہ سلاح وغیرہ درکار ہوں ہم دیں گے۔ مجھ کو منظور نہ ہوا اس لئے کہ جہاد موافق سنت کے (ہونا) چاہیے بلوا کرنا منظور نہیں۔ (سیرت سید احمد شہید۔ غلام رسول مہر: 264)

جوان شادی شدہ مردوں کا چار ماہ سے زائد گھر سے دور رہنا

حضرت عمرؓ کے دور کی بات ہے انہوں نے ایک رات ایک عورت کو یہ شعر پڑھتے ہوئے سنا۔

فو اللہ لو لا اللہ تخشی عواقبہ   لزحزح من ھذا السریر جوانبہ

اللہ کی قسم اگر (فعل بد کے) انجام کا ڈر نہ ہوتا تو اس چارپائی کے کنارے اس سے دور ہو جاتے۔

حضرت عمرؓ نے تحقیق کی تو پتہ چلا کہ اس عورت کے شوہر کو جہاد میں گئے بڑا عرصہ ہو گیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے یہ دیکھ کر کہ اس عورت کو اپنے شوہر کی طلب ہو رہی ہے اپنی بیٹی ام المومنین حضرت حفصہؓ سے پوچھا کہ عورت اپنے مرد کے بغیر کتنا عرصہ رہ سکتی ہے۔ حضرت حفصہؓ خود بھی عورت تھیں بلکہ ام المومنین بھی تھیں اور عورتیں اپنے مسائل لے کر ان کے پاس آتی تھیں۔ اس لئے وہ عورتوں کی فطری ضروریات سے خوب باخبر ہوں گی۔ انہوں نے تحقیقی جواب دیا کہ چارہ ماہ تک اور یہ جواب چونکہ ان جیسی عورتوں سے مل سکتا تھا اس لئے حضرت عمرؓ نے ان کی بات کو لے کر فوج کے کمانڈروں کو یہ حکم جاری فرمایا کہ شادی شدہ فوجی اپنی بیوی سے چار ماہ سے زائد دور نہ رہے۔

حضرت عمرؓ کا حکم اس بارے میں قول فیصل ہے۔ وہ خلفیہ راشد ہیں اور ان کے طریقے کی اتباع امت پر لازم ہے۔ اس طریقے کے آنے کے بعد اب ہمارے لئے سابقہ طریقوں کو حجت بنانا صحیح نہیں۔

اسی طرح چونکہ یہ مسئلہ کوئی اکا دکا عورت کا نہیں بلکہ تمام مجاہدین اور دین کا کام کرنے والوں کی عورتوں کا ہے بلکہ دنیا کی خاطر دوسرے علاقوں میں جانے والوں کی

عورتوں کا بھی ہے لہذا یہ بات اس فقہی ضابطہ میں بھی نہیں آتی کہ کل دین یا مفاد عامہ کی خاطر کسی خاص شخص کے ضرر کو برداشت کیا جائے گا علاوہ ازیں کام کو دیکھ کر بہت سی متبادل صورتیں اختیار کرنا بھی ممکن ہے۔

2- قرآن پاک میں ایلاء کی مدت چار ماہ رکھی یعنی اگر کوئی قسم کھالے کہ وہ بیوی سے صحبت نہیں کرے گا تو اس کو چار ماہ کی مہلت ملے گی اگر اس دوران وہ صحبت کرلے تو قسم توڑنے کا کفارہ دے دے اور بیوی نکاح میں باقی رہے گی لیکن اگر صحبت نہ کی تو چار ماہ پورے ہوتے ہی ایک طلاق بائن پڑ جائے گی تاکہ عورت آزاد ہو کر چاہے تو کسی اور سے نکاح کرلے۔

علامہ ابن عابدینؒ لکھتے ہیں

وَلو لم يكن فى هذه المدة زيادة مضارة بها لما شرع الله تعالىٰ الفراق بالا يلاء فيها

اگر اس مدت میں عورت کا زیادہ نقصان نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ ایلاء سے اتنی مدت میں طلاق ہونے کا حکم نہ دیتے۔

ان نصوص کی بناء پر فقہاء (جو قرآن وحدیث کے ماہر ہوتے ہیں) کہتے ہیں کہ چار ماہ میں ایک مرتبہ صحبت کرنا دیانۃً واجب ہے۔ حوالجات یہ ہیں۔

(i) وَاعلم ان ترك جماعها مطلقا لا يحل له. صرح اصحابنا بان جماعها احيانا واجب لكنه لا يدخل تحت القضاء ...... ولم يقدروا فيه مدة ويجب ان لايبلغ به مدة الايلاء الا برضا و طيب نفسها (فتح القدير : باب القسم)

(ii) ويجب ديانة احيانا ولا يبلغ مدة الا يلاء الا برضا ها (درمختار)

فقہائے حنفیہ کا یہی قول ہے جو قرآن وسنت کے عین مطابق ہے۔

تنبیہ :1- ممکن ہے کہ کسی کو یہ خیال ہو کہ الا برضاھا کے الفاظ سے خود حنفیہ کے نزدیک عورت کی اجازت سے زائد عرصہ کے لئے باہر رہنا صحیح ہے۔ یہ بات

درست نہیں کیونکہ الا برضاھا کا مطلب ہے کہ شوہر کے گھر میں رہتے ہوئے اس کا صحبت کو چار ماہ سے زائد موخر کرنا بیوی کی اجازت سے جائز ہے۔ بعد میں جب بھی وہ مطالبہ کرے تو اس کا مطالبہ پورا کیا جائے گا پیشگی اجازت کافی نہیں۔ پیشگی اجازت لے کر شوہر سال دو سال کے لئے باہر چلا جائے اور عورت کو درمیان میں طلب پیدا ہو تو وہ اپنا حق وصول نہیں کر سکتی حالانکہ یہ شرعی حکم بھی موجود ہے کہ اگر بیوی اپنی باری دوسری بیوی کو دے دے خواہ ہمیشہ کے لئے کہہ دیا ہو اور پھر کسی وقت دوبارہ مطالبہ کرے تو اس کا مطالبہ پورا کیا جائے گا۔

وَ ان رضیت احدی الزوجات بترك قسمها لصاحبتها جاز ..... ولها ان ترجع فی ذلك لانها اسقطت حقالم تجب بعد فلا یسقط (هدایه باب القسم)

2۔ بعض لوگ حضرت عمرؓ کے فرمان کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ جہاد میں گئے ہوئے لوگ اگر گھر جانے کی اجازت لیں تو ان کو چار ماہ سے زائد نہ روکا جائے۔

یہ مطلب لینا درست نہیں کیونکہ

i۔ یہ مطلب روایت کردہ الفاظ سے مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ "اگر اجازت لیں" کا مضمون فرمان کے الفاظ میں موجود نہیں۔

ii۔ یہ مطلب اصل واقعہ سے بھی مطابقت نہیں رکھتا کیونکہ مطالبہ عورت کا تھا اور اس کی خاطر حکم جاری ہوا تھا کسی مرد نے مطالبہ نہیں کیا تھا لہذا یہ حکم کسی مرد کے چاہنے یا نہ چاہنے پر موقوف نہیں تھا۔

iii۔ فقہاء نے حضرت عمرؓ کے فرمان کا جو مطلب سمجھا ہے اصولی طور پر اس کو ترجیح حاصل ہے امام ترمذیؒ اپنی سنن میں فرماتے ہیں احادیث کے معانی کو فقہاء ہی زیادہ سمجھنے والے ہیں۔

3۔ مذکورہ بالا سب باتوں کے باوجود اگر کوئی شخص پھر بھی یہ خیال کرے کہ حضرت عمرؓ

نے یہ حکم جاری کرنے کے لئے اپنے اہل شوری سے مشورہ نہیں کیا اور دوسرے مسائل کی طرح اس پر اجماع نہیں کرایا اور یہ کہ یہ حضرت حفصہؓ کی اجتہادی رائے تھی اور یہ کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ سے اس بارے میں کوئی ہدایت صراحۃ یا کنایۃ ثابت نہیں اور یہ جہاد یا دعوت کے کام کے لئے بھیجنے والوں کے سپرد ہے کہ وہ ہر شخص کے حالات کی تحقیق کرکے اس کو کم و بیش مدت کے لئے بھیج سکتے ہیں تو یہ شخص اس قابل ہے کہ اس پر افسوس کیا جائے۔

اہم تنبیہ: فقہائے شافعیہ چار ماہ کی کوئی قید نہیں لگاتے۔

قال الشافعی لا یجب علیه لانه حق له فلایجب علیه کسائر حقوقه

(مغنی ابن قدامه 142:8)

امام شافعیؒ کے نزدیک چار ماہ میں صحبت کرنا مرد پر واجب نہیں ہے کیونکہ یہ دیگر حقوق کی طرح مرد کا حق ہے اس کی ذمہ داری نہیں ہے۔

اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہے

وان سافر عن امراته لعذر و حاجة سقط حقها من القسم و الوطء وان طال سفره

وسئل احمد کم للرجل یغیب عن اهله ؟ قال یروی ستة اشهر و قد یغیب الرجل اکثر من ذلك لامر لا بد له (الشرح الکبیر 140:8)

اگر اہل علم حضرات سمجھتے ہوں کہ موجودہ حالات میں امام شافعیؒ یا امام احمدؒ کے قول کو اختیار کرنے کی شدید ضرورت ہے اور وہ اس کو اختیار کرتے ہیں تو ہم یہی سمجھیں گے کہ وہ دلائل کو من و عن سمجھتے بھی ہیں اور ہم توقع رکھیں گے کہ وہ دوسرے مجتہد کے قول کو لینے کے بارے میں اصول و ضوابط اور اپنی ذمہ داریوں سے خود باخبر ہیں۔

دوسری تنبیہ: تدوین فقہ کے بعد اور فقہاء کی ترجیح و تصحیح کے بعد مقلد

علماء کے لئے یہ کیونکر مناسب ہے کہ ائمہ فقہ کی تصریحات کو نظر انداز کر کے دور صحابہ کے واقعات سے خود استنباط کریں جب کہ ان کے استنباط فقہاء کی تصریحات کے مخالف بھی ہوں۔ ہاں اگر کوئی مسئلہ فقہ میں نہ ملتا ہو تو تبحرین حضرات قرون اولی کے حالات وواقعات کی طرف مراجعت کریں تو وہ جائز ہے۔

خلافت

رسول اللہ ﷺ کے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمانے کے بعد جو اسلامی حکومت وجود میں آئی اس کے حکمران آپ ﷺ ہوئے۔ آپ کی وفات کے بعد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے نائب اور خلیفہ کی حیثیت سے اسلامی حکومت کے حکمران مقرر کیے گئے۔ اس وقت مسلمانوں کی صرف ایک ہی حکومت تھی جو آئندہ ادوار میں پھیلتی چلی گئی اور آئندہ آنے والے حکمرانوں میں خلیفۃ المسلمین کا لقب رواج پا گیا اور ان کے نظام حکومت کو خلافت کہا جانے لگا۔ پہلے چار خلفاء کی خلافت منہاج نبوت پر تھی اور وہ خلفائے راشدین کہلاتے ہیں اور ان کی خلافت راشدہ کہلاتی ہے۔ ان کے بعد بنو امیہ کی خلافت کا دور چلا جس کے بعد بنو عباس نے خلافت سنبھالی۔ بنو عباس نے تاتاریوں کے ہاتھوں بالکل کمزور ہونے کے بعد ترکی کے سلاطین آل عثمان کو خلافت سونپ دی۔ ایک عرصہ کے بعد ترکی کی خلافت کا شیرازہ بکھرنے لگا یورپی طاقتوں نے اس قوت کو تقسیم کرنے کی بھرپور کوششیں کیں۔ بالآخر پہلی جنگ عظیم کے وقت میں خود ترکی کے بعض حکمرانوں نے خلافت کا سلسلہ ہی ختم کر دیا۔ اس دوران بعض علاقے بالکل آزاد بھی رہے مثلاً سپین میں بنو امیہ کی ایک شاخ نے اپنی خلافت قائم رکھی اور ہندوستان میں یہاں کے مسلمان حکمران بالکل آزاد تھے لیکن خلافت اور خلیفہ کا احترام اور مسلمانوں میں اس کی اہمیت وضرورت کے وہ معترف تھے اور خلیفہ کو بڑا مانتے تھے۔

مسلمان بکھرے رہیں اور آپس کے جھگڑوں میں الجھے رہیں اور ان کی قوتیں اور وسائل منتشر رہیں اس میں واضح طور سے مسلمانوں کا بڑا نقصان اور کافروں کا فائدہ ہے مسلمان سب ایک قوت رہیں یہ ہر دور کی ضرورت ہے ان کی ایک قوت ہونے کا

بڑا مظہر خلافت کا ادارہ تھا۔

خلافت دوبارہ کیسے قائم ہو؟ اس کو معلوم کرنے کے لئے پہلے خلیفہ بلکہ کسی بھی مسلم حکمران کی ذمہ داریوں کو جان لینا ضروری ہے۔

1- دین اور مسلمانوں کی حفاظت کرنا لازم ہے ظالموں کو ظلم نہ کرنے دے اور مظلوموں کو ان کا حق دلوائے۔

2- خلاف شرع امور کا مٹانا لازم ہے بایں طور کہ مرتد اور زندیق اور ملحد لوگوں کو اگر وہ توبہ نہ کریں تو قتل کرے اور اہل بدعت کو سزا دے۔

3- ارکان اسلام اور شعائر دین کو قائم کرے مثلاً نماز باجماعت کا نظام قائم کرے، زکوۃ کا شریعت کے مطابق نظام قائم کرے اور مسلمانوں کو دین کے شعائر مثلاً داڑھی رکھنے پر مجبور کرے اور کٹانے والوں کو سزا دے۔

4- دینی علوم کو زندہ کرے اور ان کو رواج دے۔

5- عدالتیں قائم کرے جہاں شریعت کے مطابق فیصلے کئے جائیں۔

6- بھلے کاموں کے حکم دینے اور تمام برائیوں سے منع کرنے کا نظام بنائے۔ کسی شخص کو یہ جرات نہ ہو کہ وہ دین کے خلاف کوئی بات کرے جو نبی ﷺ اور صحابہ کی تصریحات کے منافی ہو۔

7- وہ کافروں سے مسلسل جہاد کا نظم بنائے خواہ اس کی ابتداء مسلمانوں کی جانب سے ہی کرنی ہو یعنی یہ کہ مسلمان پہل کر کے کافروں پر حملہ کریں۔

یہ سب ذمہ داریاں پوری کرتے ہوئے تمام مسلمانوں کی قوت کو یکجا کرنا اس کا نام خلافت اسلامیہ ہے۔

اس کے لئے ظاہر ہے کہ پہلے کسی علاقہ میں صحیح دین پر قائم مسلمانوں کی حکومت کا قائم ہونا ضروری ہے پھر اس حکومت کے خلافت میں تبدیل ہونے کے دو طریقے ہیں۔

1- یہ حکومت اپنے قہر و غلبہ سے دیگر متصل مسلمان ملکوں کو اپنے میں مدغم ہونے پر مجبور کردے۔

2- آس پاس کے مسلمان ملکوں میں بھی دینی حکومتیں قائم ہو جائیں اور سب مل کر دین کا حکم سمجھتے ہوئے کسی ایک اہل حکمران کو اپنا مرکزی حکمران یعنی خلیفہ تسلیم کرلیں اور اس کے علاقے کو دارالخلافہ مان کر اپنے تمام وسائل اس کے اختیار میں دے دیں اور اس کی تابعداری قبول کریں۔

تنبیہ: وہ مسلمان حکومتیں جو عملاً لادینیت پر قائم ہیں وہ اگر مل کر کوئی مشترکہ نظام اختیار کرلیں تو اس کو خلافت نہیں کہا جاسکتا اگرچہ وہ اس کو خلافت کا نام بھی دے دیں۔

سنت وبدعت کے اصول

سنت وبدعت کے تقابل کے وقت

سنت سے مراد وہ عمل ہوتا ہے جس کے جواز کی کوئی بھی شرعی دلیل موجود ہو خواہ قرآن ہو حدیث ہو یا قیاس ہو جب کہ

بدعت سے مراد وہ چیز ہے خواہ عمل ہو یا عقیدہ جس کو دین کا کام سمجھا جائے حالانکہ اس کے جواز کی کوئی بھی شرعی دلیل نہ ہو۔

بدعت کا جو معنی کیا گیا ہے اس کے مطابق ظاہر ہے کہ وہ ایک مذموم کام ہے اور حدیث میں اس کو مردود کیا گیا ہے۔

بدعت وسنت کو پہچاننے کا ایک ضابطہ

خیر القرون یعنی صحابہ تابعین اور تبع تابعین کے دور کے بعد دین میں جو چیزیں ایجاد کی گئیں ان کی دو قسمیں ہیں۔

1-ان کا سبب جدید ہے اور ان پر دین کے ایک ضروری حکم کو پورا کرنا موقوف ہے مثلاً دین کا ایک حکم کہ دین کی حفاظت کی جائے ضروری حکم ہے۔ صحابہ اور تابعین کو نبی ﷺ کی برکت سے تعلق مع اللہ حاصل تھا اور حافظہ اس قدر قوی تھا کہ جو کچھ سنتے تھے وہ سب نقش کالحجر ہو جاتا تھا فہم بھی عالی تھا اور پرہیزگاری ودینداری بھی غالب تھی ان کا حافظہ اور فہم وعمل اور پرہیزگاری یہ چیزیں دین کی حفاظت کے لئے کافی تھیں۔ بعد کے ادوار میں حفظ وفہم کی قوتیں کمزور ہونے لگیں اور دینداری میں بھی فرق پڑنے لگا۔ اس وقت اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں دین کا کچھ حصہ ضائع نہ ہو جائے اس لئے ضرورت سمجھی گئی کہ دین کی تمام باتوں کو مدون کر لیا جائے اور ان کی تدریس کے لئے مدارس قائم کئے جائیں۔ دینی کتابوں اور مدارس کا سبب پہلے نہ تھا اب پیدا ہوا اور

دین کی حفاظت ان پر موقوف تھی لہٰذا یہ بدعت نہیں بلکہ ضابطہ ہے کہ جس پر کوئی واجب موقوف ہو وہ خود واجب ہوتی ہے۔

2- جن کا سبب قدیم ہے جیسے کسی کے مرنے پر تیجہ دسواں اور چہلم وغیرہ کے ان کا سبب قدیم ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ و تابعین کے دور میں بھی مسلمان مرتے تھے لیکن ان ادوار میں ایسی کوئی رسم نہیں کی جاتی تھی۔ سبب ہونے کے باوجود ان کا نہ کرنا ان کے بدعت ہونے کی دلیل ہے۔

بدعت کی تفصیلی صورتیں

1- خود وہ شے اپنی ذات کے اعتبار سے ناجائز ہو۔

مثلاً بارہ ربیع الاول اور شب برات کے موقع پر چراغاں کرنا اور یہ عقیدہ رکھنا کہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ہر طرح کا اختیار اور قدرت عطا فرمادی تھی اور یہ کہ آپ ﷺ حاضر و ناظر ہیں اور یہ کہ آپ ﷺ کو روز اول سے جنت و دوزخ میں داخلہ تک ذرہ ذرہ کا علم ہے۔

2- شے اصل کے اعتبار سے جائز ہو پھر

1- اپنی طرف سے مطلق کو مقید کرنا اور مقید کو مطلق کرنا۔

یعنی جو عمل کسی وقت کے ساتھ مخصوص نہ ہو اس کو وقت کے ساتھ خاص کرنا اور جو وقت کے ساتھ خاص ہو اس کو دوسرے وقتوں میں کرنا

حضرت ابوہریرہؓ نقل کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

لاتختصوا لیلة الجمعة بقیام من بین اللیالی ولا تختصوا یوم الجمعة بصیام من بین الایام الا ان یکون فی صوم یصوم احد کم

"شب جمعہ کو دوسری راتوں سے (نفلی) نماز اور قیام کے لئے خاص نہ کرو اور جمعہ کے دن کو دوسرے دنوں سے (نفلی) روزہ کے لئے خاص نہ کرو مگر ہاں اگر کوئی شخص سنت کے خاص کردہ روزے رکھتا ہے (مثلاً ایام بیض یا پندرہویں شعبان کا روزہ

رکھتا ہے) اور جمعہ کا دن بھی اس میں آجائے تو خیر"۔

چونکہ نبی ﷺ نے جمعہ اور نماز جمعہ کے بہت سے فضائل بیان فرمائے تھے تو خدشہ تھا کہ کوئی اپنی رائے سے روزہ نماز جیسی بنیادی عبادت میں اپنی ایجاد نہ کر بیٹھے اس لئے خود آپ نے منع فرمادیا کہ جتنے کام جمعہ اور شب جمعہ میں ہم نے فرمادیئے یعنی نماز جمعہ اور خطبہ اور لوازمات فقط وہی اس میں افضل اور سنت ہیں اگر کوئی اس پر قیاس کر کے اور اضافہ کرے گا تو وہ مقبول نہ ہوگا لہذا اس حدیث میں ارشاد ہوا کہ تم جمعہ اور شب جمعہ کو صوم و صلوٰۃ کے واسطے خاص نہ کرو کیونکہ نفلی صوم و صلوٰۃ تمام اوقات و ایام میں یکساں ہیں کسی وقت کی خصوصیت ہمارے حکم کے بغیر درست نہیں۔

اور وہ کام جو جمعہ کے دن کے ساتھ خاص تھے جیسے نماز اور خطبہ جمعہ وغیرہ ان میں جمعہ کی تخصیص کو نظرانداز کرنا بھی منع کر دیا کہ یہ کام کسی اور دن نہیں ہو سکتے۔

ii- مستحب کام کو ناجائز ہیئت کے ساتھ ادا کرنا

مثلاً تسبیح و تہلیل اور درود مسنون اذکار ہیں اور مسجد میں بھی ان کو کرنا منع نہیں اور صحابہ کے دور میں بھی ذکر کی مجالس ہوتی تھیں اسی طرح سے کہ جس کو جو وقت ملتا وہ مسجد میں آکر اپنے اپنے ذکر میں مشغول ہو جاتا۔ چند لوگ از خود آکر مسجد میں ایک جگہ بیٹھ کر ذکر کرنے لگتے تو یہ مجلس ذکر بن جاتی۔

لیکن اگر وہ سب لوگ جو کسی جگہ اکٹھے ہوں یا ان میں سے بعض اگر یہ اہتمام و التزام کریں کہ وہ ایک وقت میں ایک ہی ذکر کریں گے خواہ آواز سے یا آہستہ سے تو یہ بدعت ہے کیونکہ اس ہیئت سے ذکر کرنا کسی شرعی دلیل سے ثابت نہیں بلکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے کچھ لوگوں کو ایسا کرتے دیکھا تو بتایا کہ یہ بدعت ہے اور ان کو اس سے منع کیا۔

iii- مستحب کام کے لئے لوگوں کو اکٹھا کرنا جیسے میلاد کے لئے یا نفلی ذکر کے لئے یا نفلی عبادت کے لئے لوگوں کو اکٹھا کرنا۔

iv- مباح یا مستحب کو واجب یا سنت موکدہ اعتقاد کرنا

v- کفار کے ساتھ مشابہت کرنا اگرچہ کسی ایک پہلو سے ہو

مثلاً کھانے پر فاتحہ یا ختم پڑھنا بدعت ہے کیونکہ اس میں ہندوؤں کے ساتھ تشبہ ہے اس لئے کہ تمام ہندوؤں میں یہ رسم ہے اور ان کا یہ شعار ہے کہ کھانے پر وید پڑھاتے ہیں اسی طرح سوئم میں بھی ہندوؤں کے ساتھ مشابہت ہے کہ ہندوؤں میں بھی تیسرے دن کی تخصیص ہے۔

vi- جائز عبادت میں اپنی طرف سے اضافہ کرنا۔

مثلاً نماز جنازہ کے بعد وہیں ٹھہر کر دعا میں مشغول ہونا کیونکہ یہ کسی شرعی دلیل سے ثابت نہیں۔

اسی طرح ایک شخص نے چھینکنے پر الحمد للہ کہا اور اس کے ساتھ والسلام علی رسول اللہ کا اضافہ کر دیا تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس سے منع کیا۔

تنبیہ: جس طرح رسول اللہ ﷺ کا کسی کام کو کرنا سنت ہے اسی طرح آپ کے کسی کام کو ترک کرنا اور چھوڑنا بھی سنت ہے۔

تنبیہ: جب کسی کام کے سنت یا بدعت یعنی شرعی دلیل سے ثابت ہونے نہ ہونے میں تردد ہو تو اس وقت ضابطہ یہ ہے کہ اس کام کو کرنے سے بچا جائے کیونکہ اگر وہ بدعت نہ ہو تو چونکہ وہ فرض و واجب نہیں اس لئے اس کا کرنا فقط مباح یا مستحب ہوگا جس کے نہ کرنے میں کوئی حرج نہیں اور اگر وہ بدعت ہوا تو اس کے کرنے میں گناہ اور حرج ہے لہٰذا ایسے کام سے بچنا ضروری ہے۔

تقلید اور ترک تقلید

وہ مسائل جن میں بظاہر حدیث میں تعارض ہے یا وہ مسائل جن کے بارے میں قرآن یا حدیث کے الفاظ میں ایک سے زائد معنی نکلتے ہوں یا وہ مسائل جن کا ذکر بظاہر قرآن و حدیث میں نہ ہو ان مسائل میں امت کے قرآن و حدیث اور شریعت کے متفق علیہ ماہرین سے حل پوچھنے کا نام تقلید ہے۔ اگر ان سے نہ پوچھیں بلکہ خود ہی کوئی رائے قائم کرلیں یا موجودہ دور کے غیر متفق علیہ اور غیر مجتہد عالم سے پوچھیں تو یہ ترک تقلید ہے۔

مثلاً کوئی پیچیدہ مرض ہو تو اگر کسی ماہر فن سے جس کی مہارت کی گواہی بہت سے لوگ دیتے ہوں علاج کرائیں اور نسخہ لکھوائیں تو یہ تقلید ہے اور اگر اس کے پاس نہ جائیں اور خود ہی کچھ حوالے دیکھ کر نسخہ تجویز کرلیں یا کسی عام طبیب سے نسخہ لکھوا لیں جو پورا ماہر نہیں تو یہ ترک تقلید ہے۔ اس کا غلطی ہونا واضح ہے۔

اگر ہمارے علاقے میں صرف ایک ہی ماہر ہوں اور تمام پیچیدہ امراض میں اسی سے نسخے تجویز کرائیں تو یہ بھی جائز بات ہے بلکہ بالکل معقول بات ہے۔ اور اگر کسی علاقے میں دو چار ماہر ہو اور سب کے نسخے ہمیں مہیا ہو جائیں اور ہم یہ کریں کہ کچھ بات ایک کی لے لی اور کچھ دوسرے کی لے لی تو جب کہ ہم خود مہارت نہ رکھتے ہوں ہماری یہ حرکت بہت ہی نامناسب اور غیر معقول ہوگی کہ اندیشہ ہے کہیں کوئی متضاد چیزیں مل کر نقصان دیں۔

بعینہ یہی صورتحال مذکورہ بالا مسائل میں ہے امام ابو حنیفہؒ قرآن و حدیث کے وہ عظیم ماہر ہیں کہ تیرہ سو سال سے دنیا ان کی علمیت اور قرآن فہمی اور حدیث دانی و حدیث فہمی کی معترف ہے اور سب مسلمان ان کا احترام کرتے رہے ہیں۔ اگر ہم

مسائل ان سے پوچھ لیں یا ہمارے علاقہ میں چونکہ علماء سب حنفی ہیں اور صرف ان ہی سے پوچھ سکتے ہیں تو ان سے پوچھ لیا کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں مسئلہ بتادیں تو یہ بہت مناسب بات ہے اور اس کو شرک کہنا بہت ہی عجیب اور حقیقت سے بعید بات ہے۔

مسلمانوں کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ چاروں ائمہ یعنی امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمھم اللہ برحق تھے اور ان سب کے بتائے ہوئے مسائل کا مدار قرآن وحدیث ہیں لہٰذا جو شخص ان میں سے جس کی تقلید کرتا ہے وہ قرآن وحدیث پر ہی عمل کرتا ہے اور کسی کو بھی حتمی طور پر ہم غلط نہیں کہہ سکتے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے اعمال مقبول ہیں۔ لہٰذا ایک کے قول پر چلنے والا کسی دوسرے کے قول پر چلنے والے کو تبلیغ نہیں کرتا کہ وہ فلاں کے قول کو چھوڑ کر اس کے قول کو اختیار کرے۔ ایسی تبلیغ اصولی طور پر غلط ہے کیونکہ اس میں دوسرے کو حتمی طور پر غلط بتانا ہے اور خود کو حتمی طور پر درست قرار دینا ہے حالانکہ یہ بات غلط ہے اس لئے کہ مذکورہ بالا مسائل انسانی تحقیق پر مبنی ہیں اور محسوسات سے ماورا جو انسانی تحقیق ہو وہ حتمی اور یقینی نہیں ہوتی۔

اب وہ لوگ جو دین کے دور اول کے بڑے بڑے علماء کو چھوڑ کر خود اپنی تحقیق کو مدار بناتے ہیں اور پہلوں کو حتمی طور پر غلط کہتے ہیں یہ تو بہت ہی بڑی غلطی ہے۔

پھر تقلید کو غلط کہنے والے لوگ حضرت شاہ ولی اللہ کو اپنا بڑا مانتے ہیں حالانکہ وہ تقلید کے قائل ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ اسماعیل شہید نے ایک مرتبہ رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے اٹھتے ہوئے رفع یدین کرنا شروع کیا اور کہا کہ مردہ سنت کو زندہ کرنے میں سو شہیدوں کا ثواب ہے۔ لوگوں نے اس کا تذکرہ ان کے تایا اور شاہ ولی اللہ کے بیٹے شاہ عبدالقادر سے کیا تو انہوں نے فرمایا ہم نے تو سمجھا تھا کہ اسماعیل کو کچھ علم

حاصل ہو گیا ہے وہ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھا کہ (اگر ہم یہ فرض بھی کریں کہ اس موقع پر رفع یدین سنت ہے تو) ایک سنت سے ہٹ کر دوسری سنت پر عمل کرنا سنت کو زندہ کرنا نہیں ہوتا رفع یدین کا ترک بھی سنت ہے جو حدیث سے ثابت ہے تو لوگ اس سنت پر عمل کر رہے ہیں اس سے لوگوں کو ہٹا کر دوسری سنت یعنی رفع یدین پر لگانا سنت زندہ کرنا نہیں سنت زندہ کرنا تو بدعت یا فسق کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔

اس پوری بحث کو اب دو مثالوں سے سمجھئے۔

1- حضرت مالک بن حویرثؓ کہتے ہیں کہ۔

انه رای النبی ﷺ رفع یدیه فی صلاته اذا رکع و اذا رفع راسه من الرکوع و اذا سجد و اذا رفع راسه من السجود ...... (نسائی)

انہوں نے نبی ﷺ کو دیکھا کہ آپ نے رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے اٹھتے ہوئے اور سجدہ میں جاتے ہوئے اور سجدہ سے اٹھتے ہوئے رفع یدین کیا (یعنی اپنے دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھائے)۔

اب سجدہ میں جاتے ہوئے اور سجدہ سے اٹھتے ہوئے رفع یدین کرنا بالاتفاق منسوخ ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے سامنے یہ حدیث ہے۔

عن علقمة قال قال عبدالله بن مسعودؓ الااصلی بکم صلاة رسول الله ﷺ فصلی فلم یرفع یدیه الافی اول مرة

علقمہ سے روایت ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کیا میں تم کو رسول اللہ ﷺ کی نماز نہ پڑھاؤں تو انہوں نے نماز پڑھائی اور تکبیر تحریمہ کہنے کے علاوہ اور کسی وقت رفع یدین نہیں کیا۔

امام ترمذیؒ اس حدیث کو حسن کہتے ہیں جو صحیح ہی کی طرح حجت اور واجب العمل ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں حضرت براء بن عازبؓ بھی رسول اللہ ﷺ سے یہی مضمون

نقل کرتے ہیں اور امام ترمذیؒ فرماتے ہیں۔

وَبه يقول غير واحد من اهل العلم من اصحاب النبی ﷺ والتابعين

کہ بہت سے صحابہ اور تابعین کا یہی قول (و عمل) ہے۔

اس حدیث کی بناء پر اور بہت سے صحابہ و تابعین کے قول و عمل کی بناء پر امام ابو حنیفہؒ یہ فرماتے ہیں کہ معلوم ہوا کہ رکوع میں جاتے ہوئے اور رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے بھی رفع یدین کرنا منسوخ ہے اور اب اس موقع پر رفع یدین نہ کرنا ہی سنت ہے۔

جن لوگوں نے امام ابو حنیفہؒ کی اس بات پر عمل کیا صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے حدیث پر ہی عمل کیا ہے لیکن اگر کوئی ان کو یہ کہے کہ تم سنت کا ترک کر رہے ہو اور اس کی وجہ سے خود امام ابو حنیفہؒ کو برا بھلا کہے تو یہ شخص دین کا داعی نہیں بلکہ فسادی ہے لہٰذا دین کا کام کرنے والوں کو خود بھی اس روش سے بچنا چاہیے اور ایسی بات کرنے والوں سے چوکنا رہنا چاہیے۔

2- بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ امام کے پیچھے نماز پڑھتے ہوئے بھی مقتدی کو سورہ فاتحہ پڑھنی ہے لیکن اس کے مقابل اور حدیثیں بھی ہیں مثلاً

حضرت ابو ہریرہؓ نقل کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **انما جعل الامام ليوتم به فاذا كبر فكبروا واذا قرأ فانصتوا**

یعنی امام تو محض اس لئے ہے کہ اس کی اقتداء کرو تو جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور جب وہ قرأت کرے تو تم خاموش رہو۔

اس حدیث میں مطلق خاموش رہنے کا حکم ہے یہ قید نہیں ہے کہ جب امام آواز سے پڑھے تو خاموش رہو اور اس حدیث میں نہ سورہ فاتحہ کی قید ہے نہ کسی اور سورت کی لہٰذا حدیث کا مطلب یہ ہے کہ امام جب بھی قرأت کرے خواہ آواز سے یا آہستہ اور قرأت خواہ سورہ فاتحہ کی ہو یا کسی اور سورت کی ہر حال میں خاموش رہو۔

رہیں وہ حدیثیں جن میں ہے کہ سورہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی تو ایک اور حدیث میں ہے حضرت جابرؓ نقل کرتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

من كان له امام فقراء ة الامام له قراء ة

جو امام کے پیچھے ہو تو امام کی قرأت اس کی بھی قرات شمار ہوتی ہے۔

چونکہ امام سورہ فاتحہ بھی پڑھتا ہے لہٰذا اس کے مقتدی کی بھی سورہ فاتحہ کی قرات شمار ہوئی۔ اس طرح سے مقتدی کی نماز بھی سورہ فاتحہ کے بغیر نہیں ہوئی اور پہلے جو امام کے پیچھے پڑھنے کی اجازت تھی تو اس ضابطہ سے اس کو منسوخ فرمادیا۔

امام مالکؒ اپنی موطا میں حضرت جابرؓ کا یہ فیصلہ بھی نقل کرتے ہیں

من صلى ركعة لم يقرء فيها بام القرآن فلم يصل الاوراء الامام (جس نے نماز میں سورہ فاتحہ نہیں پڑھی اس نے نماز ہی نہیں پڑھی الا یہ کہ وہ امام کے پیچھے ہو)

ان دلائل کی بناء پر امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مقتدی امام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہ پڑھے بلکہ خاموشی اختیار کرے اور یہ بعینہ حدیث پر عمل ہے۔

حدیث سے تقلید کے جواز کے دلائل

عن الاسود بن يزيد قال اتانا معاذ باليمن معلما و اميرا فسألناه عن رجل توفى و ترك بنتا و اختا فقضى لابنة بالنصف و للاخت بالنصف و رسول الله ﷺ حي (بخاری)

اسود بن یزید کہتے ہیں حضرت معاذؓ ہمارے یہاں احکام دین کے معلم اور حاکم بن کر یمن میں آئے ہم نے ان سے یہ مسئلہ پوچھا کہ ایک شخص مر گیا اور اس نے ایک بیٹی اور ایک بہن وارث چھوڑی۔ حضرت معاذؓ نے بیٹی کے لئے نصف اور بہن کے لئے نصف کا حکم فرمایا اور رسول اللہ ﷺ اس وقت زندہ تھے۔

اس واقعہ میں سائل نے حضرت معاذؓ سے مسئلہ کی دلیل دریافت نہیں کی اور نہ

ہی حضرت معاذؓ نے دلیل میں کوئی آیت یا کوئی حدیث ذکر کی سائل نے ان کے علم و تقویٰ پر اعتماد کر کے مسئلہ کو قبول کر لیا۔

عن مالك انه بلغه ان عمرؓ سئل فی رجل اسلف طعاما علی ان یعطیه اياه فی بلد آخر فکره ذلك عمر و قال فاين كراء الحمل

امام مالکؒ نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ سے ایک شخص کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ اس نے کچھ غلہ اس شرط پر کسی کو قرض دیا کہ وہ شخص اس کو دوسرے شہر میں ادا کرے۔ حضرت عمرؓ نے اس کو ناپسند کیا اور فرمایا بار برداری کا کرایہ کہاں گیا۔

چونکہ اس مسئلہ میں نبی ﷺ سے کوئی صریح حدیث نہیں ہے لہذا یہ جواب قیاس سے تھا لیکن اس کی دلیل نہ پوچھی گئی نہ بیان کی۔

تقلید شخصی یعنی تمام مسائل کسی ایک مجتہد سے پوچھنا

سئل ابو موسی ثم سئل ابن مسعود و اخبر بقول ابی موسیٰ فخالفه ثم اخبر ابو موسی بقوله فقال لا تسألونی مادام هذا الحبر فيكم (بخاری)

حضرت ابو موسیٰؓ سے ایک مسئلہ پوچھا گیا پھر وہی مسئلہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے پوچھا گیا اور ان کو حضرت ابو موسیٰ کا جواب بھی بتایا گیا حضرت ابن مسعودؓ نے ان سے مختلف فتویٰ دیا پھر ان کے فتویٰ کی خبر جب حضرت ابو موسیٰ کو دی گئی تو انہوں نے فرمایا جب تک یہ متبحر عالم (یعنی عبداللہ بن مسعودؓ) تم میں موجود ہیں تم مجھ سے مت پوچھا کرو۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے اس فرمانے سے کہ ان کے ہوتے ہوئے مجھ سے مت پوچھو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ہر مسئلہ میں ان سے پوچھنے کے لئے فرمایا ہے اور یہی تقلید شخصی ہے۔

امام ابو حنیفہؒ اور علم حدیث

امام ابو حنیفہؒ جن کا نام نعمان بن ثابت ہے سن-80 ہجری میں پیدا ہوئے جو

صحابہ کی موجودگی اور اعلیٰ درجہ کی برکات کا زمانہ تھا خود امام صاحب فرماتے ہیں کہ میری سات صحابہ سے ملاقات ہوئی جو یہ ہیں حضرت انس بن مالک، حضرت عبداللہ بن جزء زبیدی، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت معقل بن یسار، حضرت واثلہ بن اسقع اور حضرت عائشہ بنت عجرد ؓ اس طرح امام ابو حنیفہ ؒ تابعی بھی ہیں آپ کا انتقال سن 150 میں ہوا۔

امام ابو حنیفہ ؒ کے حدیث میں شیوخ اور اساتذہ کی تعداد بے حدو شمار ہے حدیث میں ان کے چار ہزار اساتذہ تو فقط تابعین تھے جو حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ او حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگرد تھے علامہ جلال الدین سیوطیؒ نے تبییض الصحیفہ میں علامہ جمال الدین مزیؒ سے چھہتر بڑے بڑے شیوخ کا ذکر کیا ہے جن سے امام ابو حنیفہ ؒ نے حدیثیں حاصل کیں۔

مشہور محدث مسعر بن کدام (المتوفی 155ھ) کہتے ہیں۔

"میں نے ابو حنیفہ کے ساتھ حدیث کی تحصیل کی لیکن وہ ہم پر غالب رہے"

جرح و تعدیل کے امام یحییٰ بن سعید قطانؒ فرماتے ہیں۔

"اللہ کی قسم امام ابو حنیفہ اس امت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے جو کچھ وارد ہے اس کے سب سے بڑے عالم ہیں"۔

امام محمد بن سماعہؒ کہتے ہیں

"امام ابو حنیفہؒ نے چالیس ہزار حدیثوں سے کتاب الآثار کا انتخاب کیا ہے"

امیر المومنین فی الحدیث امام عبداللہ بن مبارک جو خود امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد تھے اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے کہ آثار واحادیث کو ضروری سمجھو مگر ان کے لئے ابو حنیفہ کی ضرورت ہے کیونکہ وہ حدیث کے معنی جانتے ہیں۔

مشہور محدث وکیع بن جراحؒ محدثین سے کہا کرتے تھے کہ اے لوگو تم حدیثیں طلب کرتے ہو اور ان کے معنی طلب نہیں کرتے اس میں تمہاری عمر اور تمہارا دین

ضائع ہو جائے گا۔ مجھے آرزو ہوتی ہے کہ ابو حنیفہ کی فقہ (جو قرآن وحدیث کی تفسیر ہے) کا دسواں حصہ ہی مجھے حاصل ہوتا۔

ایک بار مشہور محدث اعمشؒ نے امام ابو حنیفہ کو یہ دیکھ کر انہوں نے ان سے سنی ہوئی حدیثوں سے وہ وہ احکام نکالے جن کی طرف خود امام اعمش کی توجہ بھی نہیں ہوئی یہ فرمایا **يا معاشر الفقهاء انتم الاطباء و نحن الصيادله**

یعنی اے گروہ فقہاء تم تو طبیب ہو اور ہم محدثین عطار ہیں (جن کے پاس ہر طرح کی دوائیں ہوتی ہیں لیکن وہ ان کے خواص اور فوائد نہیں جانتے اس طرح ہم محدثین کے پاس بہت سی حدیثیں تو جمع ہیں لیکن ان میں جو احکام ہیں ان تک ہماری نظر نہیں جاتی جب کہ طبیب کی طرح تمہاری نظر ان احادیث کے معانی پر ہوتی ہے۔

دین کا علم حاصل کرنا

حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا طلب العلم فریضة علی کل مسلم دین کا ضروری علم سیکھنا ہر مسلمان (مرد و عورت) پر فرض ہے
یہ سن کر جستجو ہوتی ہے کہ دین کے ضروری علم کی مقدار اور اس کے حدود اربعہ کیا ہیں؟ تو یہ بات واضح ہے کہ آدمی کو خود بھی دین پر چلنا ہے، اس کے لئے اپنے عقیدے بھی درست رکھنے ہیں اور ان لوگوں سے بچنے کا سامان بھی کرنا ہے جو معاشرے میں گمراہ عقائد و اعمال کا پرچار کرنے کے لئے جابجا کام کر رہے ہیں، اپنی معاشرت، اپنی معیشت اور اپنے معاملات کو دین کے مطابق چلانا ہے اور کم از کم اپنے گھر والوں کو دین سکھانا ہے اور ان کو گمراہی سے بچانے کی فکر بھی کرنی ہے اور جتنی زیادہ گمراہیاں ہوں اتنا زیادہ دفاع کرنا ہوگا۔

اس سب کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کو اپنے ضروری عقائد معلوم ہوں تاکہ ان کو درست رکھ سکے۔ بد عقیدہ لوگوں کی گمراہیوں اور ان کے باطل استدلال کا علم ہو تاکہ کبھی واسطہ پڑے تو ان کے دھوکہ میں نہ آئے۔ دین کے اصول کا پتہ ہو تاکہ صحیح لیکن ناواقف لوگوں کو بگاڑنے کے لئے ہر وقت تاک لگائے لوگوں کی بے اصولیوں کا اندازہ ہو۔ اور اپنے اعمال و معاملات کو معلوم کرے تاکہ وہ راہ راست پر رہیں۔ اس کے لئے اتنا بھی کافی نہیں کہ کچھ واجبی سی باتیں معلوم کرلے اور مطمئن ہو جائے بلکہ کچھ وقت نکال کر ٹھوس بنیادوں پر ضروری علم حاصل کرے۔ اس غرض کو پورا کرنے کے لئے ہم نے فہم دین کے نام سے ایک کورس ترتیب دیا ہے جو تین کتابوں پر مشتمل ہے جن کے نام یہ ہیں 1- اسلامی عقائد 2- اصول دین 3- مسائل بہشتی زیور نئی ترتیب 2 حصوں میں۔

موجودہ دور میں اتنا علم سیکھنا ضروری ہے صرف مستحب نہیں

تنبیہ: بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ضرورت پڑنے پر مسئلہ معلوم کرلیں گے اور اس کو وہ طلب علم کے لئے کافی سمجھتے ہیں یہ بات بالکل درست نہیں کیونکہ:

1- مسئلہ معلوم کرنے کا داعیہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب آدمی کو احساس ہو کہ اس مسئلہ کا مجھے سرے سے علم نہیں یا اچھی طرح علم نہیں جس بات کی طرف اسے توجہ نہ ہوگی یا اپنی جانب میں وہ اسے صحیح سمجھتا ہوگا تو اس کے بارے میں وہ کیوں کسی سے پوچھے گا۔ اس احساس کو پیدا کرنے کے لئے بھی بنیادی علم کی ضرورت ہے۔

2- بہت سے مسائل ایسے ہوتے ہیں جن سے متعلق واقعہ تو ہو چکا ہوتا ہے مثلاً ایک شخص نے بیوی کو محض ڈرانے دھمکانے کی نیت سے تین طلاقیں دے دیں اب وہ مسئلہ معلوم کرے گا تو اس سے واقعہ کا تدارک تو نہیں ہوسکے گا ہاں اس کو یہ علم ہو جائے گا کہ تینوں طلاقیں واقع ہو چکیں اور بیوی اسکے نکاح سے نکل گئی۔ اگر اسکو پہلے سے علم ہوتا کہ اس طرح کرنے سے یہ ہوتا ہے تو وہ ایسا کرنے سے پہلے خوب سوچ لیتا اور اگر طلاق دینے کی نیت نہ ہوتی تو اس سے پرہیز کرتا۔

3- بعض اوقات کوئی راہ حق سے بھٹکا ہوا دین کے نام پر کوئی بات کہتا ہے جو سننے والے کو پسند آتی ہے اور وہ اس کو صحیح سمجھتا ہے حالانکہ وہ واقع میں بالکل غلط ہوتی ہے مثلاً دین اور عبادت کا مطلب کوئی شخص وہ بتاتا ہے جو ہم پہلے لکھ چکے یں اور اس کا غلط ہونا بھی واضح کر چکے ہیں۔ سننے والا اپنی عقل سے اس کو صحیح سمجھ لیتا ہے لہٰذا وہ اس بارے میں کسی اہل علم سے پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرے گا اور اپنی لاعلمی کی وجہ سے غلط راہ پر چلنا شروع کردے گا۔

غرض موجودہ دور میں دین کا اتنا علم جس کی ہم نے تحدید کی ہے اوسط درجے کے مرد و عورت کے لئے ضروری ہے اور پھر مزید کوئی مسئلہ پیش آجائے تو اس کے لئے

علماء سے رجوع کرلے۔

عورتوں کو پڑھانے کے یہ طریقے ہو سکتے ہیں:

1- گھر میں کوئی مرد باصلاحیت ہے تو وہ یہ نصاب خود کسی اچھے عالم سے پڑھتا جائے اور گھر کی عورتوں کو پڑھاتا جائے۔

2- اگر محلہ میں کوئی دین کا علم رکھنے والی خاتون ہوں تو ان سے پڑھ لیں۔

اس مرحلہ سے اوپر ایک اور درجہ ہے جو واجب نہیں لیکن مستحب ہے اور وہ ہے پورے قرآن پاک کی مختصر تفسیر اور ضروری احادیث کا علم حاصل کرنا۔ اس سلسلے میں بھی ہمارا کام جاری ہے۔

مکروہات کا ارتکاب

کسی بھی طرح سے دین کا کام کرنے والوں میں بعض اوقات لوگوں کی اصلاح کے جذبہ سے یہ بے احتیاطی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اس کی خاطر مکروہات کے ارتکاب کو بھی آسان سمجھنے لگتے ہیں پھر بعض کی تو محض حاصل ہونے والے فوائد پر نظر ہوتی ہے، بعض ارتکاب کے جواز کے لئے کچھ تاویل کر لیتے ہیں اور بعض تو اس حد تک چلے جاتے ہیں کہ وہ مکروہات ان کی نظر میں مکروہات ہی نہیں رہتے۔

اس کی ایک واضح مثال مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ہے کہ وہ ایک وقت میں محفل میلاد میں بلانے سے شریک ہو جاتے تھے اور وہاں اصلاحی وعظ کہتے تھے مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو اس کا علم ہوا تو ناگواری کا اظہار کیا۔ مولانا تھانویؒ نے اس پر مولانا گنگوہیؒ کو اپنے عمل کی کچھ تاویل بھی لکھی اور جو فوائد پیش نظر تھے ان کو تحریر کیا مولانا کی اپنی عبارت میں فوائد یوں ذکر ہیں۔

"میں نے وہاں دیکھا کہ وعظ میں لوگ کم آتے ہیں اور مجالس (میلاد) میں زیادہ پھر ہر مذاق اور ہر جنس کے۔ چنانچہ ان مجالس میں ان کو وعظ و نصیحت کرنے کا اور ان کے عقائد و اعمال کی اصلاح کا بخوبی موقعہ ملا اور سینکڑوں بلکہ ہزاروں آدمی اپنے عقائد فاسدہ اور اعمال سیہ سے تائب ہو گئے اور نیک و صالح بن گئے بہت سے روافض (یعنی شیعہ) سنی ہو گئے بہت سے سود خور و شرابی بے نمازی وغیرہ درست ہو گئے۔

نیز میں نے دیکھا کہ ان مجالس میں شرکت کئے بغیر اس علاقہ میں کسی طرح قیام (اور کام) ممکن نہیں ذرا (مجلس میلاد میں شرکت سے) انکار کرنے پر وہابی کہہ دیا ذلیل کرنے اور زبانی و جسمانی توہین کرنے کے درپے ہو گئے اور ہر وقت (شرکت نہ کرنے سے) حیلہ و بہانہ کرنا بھی ممکن نہیں۔ یہ تو ممکن ہے اور کرتا بھی ہوں کہ سو میں سے

نوے مواقع پر عذر کر دیا اور دس جگہ شرکت کرلی اور شرکت بھی اس (ارادے) سے کہ ان لوگوں کو ہدایت ہوگی اور یوں خیال ہوتا ہے کہ اگر خود ایک مکروہ کے ارتکاب سے دوسرے مسلمانوں کے فرائض وواجبات کی حفاظت ہو تو اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی امید ہے"۔

اور تاویل کو یوں ذکر کیا۔

"(نفس ذکر میلاد تو جائز بلکہ مستحب ہے) اس کے لئے جو قیود اور تخصیصات (مثلاً ہر سال فلاں خاص مہینے یا فلاں خاص تاریخ کو ہو اور اس کے لئے خاص اہتمام کیا جائے اور لوگوں کو اس میں شرکت کے لئے بلایا جائے) ان تخصیصات اور قیود کو اگر نیکی اور عبادت مقصودہ سمجھ لیا جائے تو یہ بلاشک بدعت ہیں اور ان کو محض ایسے امور سمجھا جائے جو محض انتظام کے لئے اور مصلحت کی خاطر کئے جاتے ہیں تو پھر یہ بدعت نہیں بلکہ مباح ہوتے ہیں"۔

"میرے خیال میں یہ باتیں خلاف اولیٰ ضرور ہیں مگر دینی مصلحتوں کی وجہ سے ان کے کرنے میں گنجائش نظر آتی ہے اور عوام کی اصلاح بھی ساتھ ساتھ واجب سمجھتا ہوں"۔

لیکن آخر میں یہ بھی لکھا

"میں سچے دل سے پکا وعدہ کرتا ہوں کہ دلائل سے دل کی تسلی کے حاصل ہونے کے بعد جس طرح حکم ہوگا میں میں ہرگز کوئی حیلہ وعذر نہ کروں گا"۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے مولانا تھانویؒ کی تمام باتوں کے جواب دیئے اور یہ ضابطہ بھی تحریر کیا

"جو امر خیر غیر مشروع (یعنی ناجائز) طریقے سے حاصل ہو وہ خود ناجائز ہے"

مولانا تھانویؒ نے تمام دلائل سے مطمئن ہو کر بالآخر محفل میلاد میں شریک ہو کر وعظ کہنے کا سلسلہ بند کر دیا اور جو فائدے حاصل ہو رہے تھے ان سے اپنی نظر ہٹالی۔

بدعتی کے پیچھے نماز

یہاں بدعتی سے مراد وہ شخص ہے جو اہلسنت کے عقیدوں کے خلاف کوئی عقیدہ رکھتا ہو۔

بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنے سے متعلق تفصیل یہ ہے۔

بدعتی اور عمل کے اعتبار سے فاسق دونوں کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے پھر بھی بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنے میں کراہت زیادہ ہے بنسبت فاسق کے پیچھے نماز پڑھنے کے اس لئے فاسق ہو یا بدعتی اگر اس کو جماعت کرانے سے روکنے پر قدرت نہ ہو تو مقتدی کو چاہیے کہ وہ کسی دوسری مسجد میں جاکر نماز پڑھے خواہ جمعہ کی نماز ہو یا کوئی اور نماز۔

اگر کوئی دوسری مسجد قریب نہ ہو بہت دور ہو تو بدعتی کا امام ہونا ترک جماعت کے لئے عذر ہے۔ تنہا نماز بھی پڑھ سکتا ہے لیکن اگر کچھ ہم عقیدہ لوگوں کو جمع کرکے گھر میں جماعت کا اہتمام کرلے تو یہ زیادہ بہتر ہے اور ہر حال میں مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے کے برابر ثواب ملے گا۔

تنبیہ : 1- بدعتی جب تک کفر میں داخل نہ ہوا ہو اگر کسی نے اس کے پیچھے نماز پڑھ لی تو نماز ہو جائے گی اگرچہ کراہت تحریمی کے ساتھ۔

2- دین کا کام کرنے والوں کو اول تو یہ فکر کرنی چاہیے کہ بدعتیوں کے پیچھے نماز پڑھنے کے مکروہ تحریمی عمل سے بچتے ہوئے کام کو ترتیب دیں۔ محلّہ میں کام کرنے کے لئے گھر کو بھی مرکز بنایا جاسکتا ہے۔

اگر کہیں لوگ مسجد میں بدعتی کے پیچھے نماز پڑھنے کو مجبوری سمجھیں تو وہ کم از کم دو باتوں کا ضرور خیال رکھیں۔

ا- اپنے ذہنوں میں اس بات کو مستحضر رکھیں کہ ہم ایک مکروہ تحریمی کے مرتکب ہو

رہے ہیں۔

ii-ایسا مجبوری سے کر رہے ہیں لہذا مجبوری کے بقدر ہو۔اگر مسجد میں دو آدمیوں کے ایک نماز پڑھنے سے وہاں تعلیم و بیان کا سلسلہ بنتا ہے تو بس دو آدمی فقط ایک ہی نماز پڑھیں نہ دو سے زیادہ پڑھیں اور نہ ایک سے زائد نماز پڑھیں بلا تکلف بدعتیوں کے پیچھے نماز پڑھتے چلے جانا جائز نہیں۔

اس مسئلہ سے متعلق حوالجات مندرجہ ذیل ہیں۔

ذکر الحلبی فی شرح منیة المصلی ان کراهة تقدیم الفاسق والمتبدع کراهة التحریم واما العبد والا عرابی و ولد الزنا والاعمی فالکراهة فیهم دون الکراهة فیهما

(حاشیه ابن عابدین علی البحر 1:345)

ویکره تقدیم المتبدع ایضا لانه فاسق من حیث الاعتقاد و هو اشدمن الفسق من حیث العمل لان الفاسق من حیث العمل یعترف بانه فاسق و یخاف و یستغفر بخلاف المبتدع (حلبی 514)

ان الفاسق اذا تعذر منعه یصلی الجمعة خلفه و فی غیرها ینتقل الی مسجد آخر وعلل له فی المعراج بان فی غیر الجمعة یجد اماما غیره فقال فی فتح القدیر و علی هذا فیکره الاقتداء به فی الجمعة اذا تعددت اقامتها فی المصر علی قول محمد و هو المفتی به لانه بسبیل من التحول حینئذ (بحر 1:349)

اختلف العلماء فی اقامتها فی البیت والاصح انها کاقامتها فی المسجد (بحر 1:345)

اذا انقطع عن الجماعة لعذرمن اعذارها المبیحة للتخلف و کانت نیة حضورها لولا العذر الحاصل له ثوابها لقوله ﷺ انما الا عمال بالنیات و انما لکل امرئ مانوی (مراقی الفلاح)

پہلے بزرگوں پر تنقید اور طعن و تشنیع

ایک حدیث میں قرب قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ مذکور ہے کہ
لعن آخر هذه الامة اولها یعنی اس امت کے آخر کے کچھ لوگ اس امت کے
شروع کے لوگوں پر لعن طعن کریں گے۔

وہ لوگ جن کو رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین سے ہمدردی نہیں ان سے تو ایسی طعن و تشنیع غیر متوقع نہیں لیکن وہ لوگ جن کو دین سے واقعی ہمدردی ہے لیکن پھر وہ اپنی لاعلمی اور جہالت سے بے اصولیوں کو اختیار کرلیں اور دین کو فائدہ پہنچانے کے بجائے نقصان پہنچانے لگیں تو یہ بڑی افسوسناک بات ہے۔

امت کے شروع کے حصہ میں سے صحابہ تابعین تبع تابعین تھے جو کہ خیر القرون تھے پھر ان طبقوں میں اور ان سے متصل طبقوں میں مفسرین، محدثین اور فقہاء و مجتہدین ہوئے جن کی وساطت سے رسول اللہ ﷺ کا اصل دین ہم تک علمی و عملی صورت میں پہنچا ہے۔ ان کے آپس کے اجتہادی اختلاف کے باوجود قرآن، حدیث اور امت کے اجماع واتفاق سے ان کے اعمال اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول ہیں اور فی الواقع یہ لوگ ربانیین یعنی بڑے اللہ والے بھی تھے (فقہاء و مجتہدین سے مراد وہ لوگ ہیں جو قرآن وحدیث دونوں کے ماہر تھے اور ساتھ ساتھ صحابہ کے فکر و عمل سے بھی خوب واقف تھے) یہ لوگ وہ ہیں جو یقیناً صدیقین شہداء اور صالحین میں سے ہیں۔ ان لوگوں کی اگر کوئی بات قابل اعتراض اور قابل تنقید بھی ہوتی تب بھی جب ہمیں واضح طور پر دین کا یہ حکم مل گیا کہ ان پر طعن و تشنیع اور تنقید نہیں کرنی تو کسی مسلمان کو تو اس کی جرات نہ کرنی چاہیے تھی۔ اس حکم سے متعلق

1- ایک حدیث وہ ہے جو اوپر ذکر ہوئی

2- حدیث میں صحابہ کے بارے میں ہے

الله الله فی اصحابی لا تتخذوھم من بعدی غرضا

میرے صحابہ کے بارے میں اللہ سے ڈرو اللہ سے ڈرو اور میرے بعد ان کو اپنی تنقید کا نشانہ مت بنانا۔

اور اگر حقیقت یہ ہو کہ ان حضرات کی کوئی بات قابل تنقید نہ ہو بلکہ تنقید کرنے والوں کی اپنی سمجھ اور اپنے علم و فہم کا قصور ہو تو معاملہ اور بھی سنگین ہو جاتا ہے۔

اس کے باوجود بھی اگر کوئی یہی کہے جائے کہ

"رسول خدا کے سوا کسی انسان کو معیار حق نہ بنائے نہ کسی کو تنقید سے بالاتر سمجھے، کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو، ہر ایک کو خدا کے بتائے اسی معیار کامل پر جانچے اور پرکھے اور جو اس معیار کے لحاظ سے جس درجہ میں ہو اس کو اسی درجہ میں رکھے"

تو ظاہر ہے کہ یہ شخص بے اصولی کا مرتکب ہے یہ سکالر اور محقق کہلانے کا مستحق نہیں اور دین کا کام کرنے میں اس کو رہنما سمجھنا غلط ہے۔

رہا یہ کہنا کہ رسول خدا کے سوا کسی کو معیار حق نہ بنائے اور کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ حدیث میں خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ کی پیروی کا حکم دے کر ان کو بھی معیار حق بتایا ہے

علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین المهدیین تمسکوا بها و عضوا علیها بالنواجذ

تم میری سنت کو اور ان خلفاء کی سنت کو جو رشد و ہدایت پر فائز ہیں اختیار کرو اسے خوب مضبوط پکڑ لو اور دانتوں سے تھام لو۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں

من کان مستنا فلیستن بمن قدمات ... اولئك اصحاب محمد ﷺ کانوا افضل هذه الامة ابرها قلوبا و اعمقها علما و اقلها تکلفا اختارهم الله

لصحبة نبيه و لاقامة دينه فاعرفوا لهم فضلهم واتبعوا علی اثرهم و تمسکوا بما استطعتم من اخلاقهم و سیرتهم فانهم کانوا علی الهدی المستقیم

جس کو کسی کی اقتدا کرنی ہو تو ان حضرات کی اقتدا کرے جو فوت ہو چکے ہوں (ان سے) میری مراد محمد ﷺ کے صحابہ ہیں۔ یہ حضرات ساری امت سے افضل تھے سب سے زیادہ پاک دل تھے علم میں سب سے گہرے اور تکلف و تصنع سے بالکل پاک تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی صحبت و رفاقت اور اپنے دین کی اقامت و حمایت کے لئے ان کو منتخب فرمایا لہٰذا ان کے فضل و کمال کو پہچانو ان کے نقش قدم پر چلو اور جہاں تک ممکن ہو ان کی سیرت و اخلاق کو اپناؤ کیونکہ وہ سیدھی راہ پر تھے۔

نیز قرآن پاک میں ہے

اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم

ہمیں سیدھے رستے پر چلایئے ان لوگوں کا رستہ جن پر آپ نے انعام کیا

مخصوص لوگوں کے رستے پر چلنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو رہنما جان کر ان کی مکمل پیروی کرے ان کو معیار حق بھی سمجھے اور ان کی ذہنی و فکری اور عملی غلامی اختیار کرے۔

ویسے تو ان تنقید کرنے والوں نے نبیوں کو بھی نہ چھوڑا اور صاف کہا کہ

"انبیاء کرام سے قصور بھی ہو جاتے تھے اور انہیں سزا تک دی جاتی تھی"

لیکن جب ان کو اپنی کوتاہ فہمی سے کوئی بھی ایسا نظر نہیں آتا جس پر کسی اعتراض کا موقع نہ ہو تو وہ اپنے آپ کو سب سے فائق سمجھ کر یوں کہتے ہیں

"میں نے دین کو حال یا ماضی کے اشخاص سے سمجھنے کے بجائے ہمیشہ قرآن اور سنت ہی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں کبھی یہ معلوم کرنے کے لئے کہ خدا کا دین مجھ سے اور ہر مومن سے کیا چاہتا ہے یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتا کہ فلاں اور

فلاں بزرگ کیا کہتے ہیں بلکہ صرف یہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ قرآن کیا کہتا ہے اور رسول اللہ نے کیا کہا ہے"۔

اور امت پر یہ خدائی حکم نافذ کرتے ہیں۔

"قیامت کے روز حق تعالیٰ کے سامنے ان گنہگاروں کے ساتھ ان کے مذہبی پیشوا بھی پکڑے ہوئے آئیں گے اور اللہ تعالیٰ ان (پیشواؤں) سے پوچھے گا کہ۔ہم نے قرآن اور محمد ﷺ کی پیروی کا حکم دیا تھا تم پر یہ کس نے فرض کیا کہ ان دونوں سے بڑھ کر اپنے اسلاف کی پیروی کرو۔۔۔ تم سے کس نے کہا تھا کہ قرآن کو ہاتھ نہ لگاؤ اور اپنے لئے انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو کافی سمجھو۔اس باز پرس کے جواب میں امید نہیں کہ کسی عالم دین کو کنز الدقائق، ہدایہ اور عالمگیری کے مصنفین کے دامنوں میں پناہ مل سکے گی"۔

حالانکہ کنز الدقائق 'ہدایہ اور عالمگیری میں قرآن وحدیث ہی کے صریح یا مستنبط شدہ احکام ہیں۔پھر یہی صاحب ہیں جو جلیل القدر صحابہ کے معاملہ میں قرآن و حدیث کی تصریحات کو چھوڑ تاریخ کی کتابوں کے مصنفین کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ اور انہی کی طرح کے ایک اور صاحب یوں کہتے ہیں

"اسی لحاظ سے دیکھا جائے تو اللہ کی ہدایت یعنی اسلام کے مقابلے میں تصوف وہ عالمگیر ضلالت ہے جس نے دنیا کے ذہین ترین لوگوں کو متاثر کیا ہے"

حالانکہ تصوف کا حاصل احسان ہے جس کا مطلب حدیث میں یہ بتایا گیا کہ عبادت کرتے ہوئے آدمی کے قلب ودماغ کی یہ کیفیت ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے یا کم از کم اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہے ہیں۔اور اس قسم کے لوگوں کی خود رائی ملاحظہ ہو کہ علم میراث کے اچھے بھلے معقول اور متفقہ مسئلہ کو اپنی کم فہمی سے سمجھ نہ پائے اور پہلے بزرگوں پر کس قدر استہزائیہ انداز میں تنقید کی

"فقہیان کرام اس بات پر متفق ہیں کہ لڑکیوں کے حصے بہر صورت پورے ترکہ

میں سے دیئے جائیں گے ان حضرات کی یہی غلطی ہے جس کی وجہ سے انہیں "عول" کا وہ عجیب و غریب قاعدہ ایجاد کرنا پڑا ہے جس کو ماہرین فقہ و قانون کی بوالعجبیوں میں قیامت تک بلند ترین مقام حاصل رہے گا۔ کسی شخص نے کبھی علمی دنیا کے اعجوبوں کی تاریخ مرتب کرنا شروع کی تو ہمیں یقین ہے کہ ہمارے علم میراث کی یہ یادگار اس میں سرفہرست ہو گی"۔

غرض دین کا کام کرنے والوں کو اس روش پر چلنے والوں سے چوکنا رہنے اور بچنے کی انتہائی ضرورت ہے۔